پٹھانوں کے رومان

فارغ بخاری
رضا ہمدانی



پٹھانوں کے رومان



• فارغ بخاری
• رضا ہمدانی

نیا مکتبہ پشاور

پٹھانوں کے رومان

فارغ بخاری
رضا ہمدانی

نیا مکتبہ • محلہ خداداد • پشاور (پاکستان)

سنہ ۱۹۵۵ء

اشرف پریس ۔ لاہور

ترتیب

پشتو کی عوامی کہانیاں

افسانوی چاشنی کے ساتھ

پٹھانوں کے رومان

اٹک کے اس پار، —— بسنے والے لاکھوں انسان جب زندگی کی مختنرزائیوں سے تھک کر گھڑی دو گھڑی کے لئے سستانے لگتے ہیں۔ جب محنت و مشقت کے خونین جبڑوں سے نجات پاکر اپنے اپنے حجروں میں غم دوراں کے عفریت سے مخلصی پانے کی سوچتے ہیں۔ تو داستان سرا کا زخمہ رباب کے تاروں کو قوت گویائی دے دیتا ہے، اور لوہے کے بے جان ساکت و جامد تاروں سے جادو بھرے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں، اور وہ لمحے دو لمحے کے لئے ایک طلسماتی فضا میں کھو جاتے ہیں۔

دیگر اقوام کی طرح پٹھانوں میں بھی کئی لوک کہانیاں، مشہور ہیں۔ ان بے شمار کہانیوں میں چند ایک ایسی بھی ہیں جو شدت تاثر کے باعث سارے پٹھان معاشرے میں پسند کی جاتی ہیں —— بعض کہانیاں تو پٹھانوں میں عمومی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو ہر علاقے ضلعے، قبیلے، پتے اور گاؤں میں رائج ہیں۔ لیکن کچھ ایسی بھی ہیں۔ جو صرف ایک خطے یا قبیلے تک محدود ہیں۔

پشتو کی لوک کہانیاں سب کی سب منظوم اور مطبوعہ ہیں جو بہ آسانی دستیاب ہو جاتی ہیں —— مختلف شعرا یا نظم گو فنکاروں نے ان کہانیوں کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ مقامی یا علاقائی کہانیوں کے علاوہ بے شمار ایسی کہانیاں بھی ہیں جو یکسر خارجی ہیں۔ اور پٹھان معاشرے کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان میں زیادہ تر جنوں دیووں اور پریوں کے قصے، طلسماتی کہانیاں اور اساطیری و ماورائی انداز کے

افسانے ہیں، بعض تو فارسی ادب سے براہ راست ترجمہ کی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں گل بکاؤلی، گل صنوبر، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، بہرام و گل اندام، گلفام شہزادہ، سیف الملوک بدیع الجمال، قصۂ جمجمہ، وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ یہ قصے کہانیاں بھی تمام کی تمام منظوم ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ ان کہانیوں کا اردو روپ ہے جو صرف پٹھان معاشرے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ اور جن میں اسی معاشرے کے خد و خال نمایاں ہیں۔ یہ کہانیاں ان کئی "لوک کہانیوں" کا ایک کڑا انتخاب ہے۔ جو پٹھانوں میں رائج ہیں۔ اور صرف پٹھان داستان نگاروں کے تخیل کی اپج ہیں۔ بعض مقامی کہانیوں میں بھی ماورائی افسانے اور روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن جو انتخاب پیش کیا جا رہا ہے اس میں ایسی باتیں کم دیکھنے میں آئیں گی۔ پشتو کی ان عوامی کہانیوں میں چند ایک چیزیں قدر مشترک کی حیثیت سے پائی جاتی ہیں۔

عشق و محبت کی پاکیزگی

خلوص و عزم

احساس قومی ــــــ اور ایفائے عہد

یہ روح ان تمام کہانیوں میں مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہے۔ ویسے جہاں تک مرکزی کردار کا تعلق ہے تمام کہانیاں ایک غیر معمولی حسین و جمیل محبوبہ کے گرد گھومتی ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہمارے پشتون داستان سازوں کے اعصاب پر بھی عورت ہی سوار ہے۔ البتہ یہ عورت ایک مثالی عورت ہے عظیم کردار کی مالکہ، بڑی پاکباز، ہر حال میں اپنی قبیلوی روایات کا تحفظ کرنے والی شیر دل عورت۔

بعض احباب 'لوک کہانیوں' کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی ادبی اور تخیلی حیثیت کو مجروح کرنا اور اچھے خاصے شعر کو مدرسے لے جانا ہے۔ اس قسم کی کہانیاں دنیا کی مختلف اقوام قبائل اور معاشروں میں رائج ہیں۔ اگر تاریخ کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے تو کوئی کہانی بھی اس معیار پر پوری نہیں اتر سکتی —— لیلیٰ مجنوں۔ شیریں فرہاد، وامق عذرا، ایسی بین الاقوامی شہرت رکھنے والی کہانیوں کے متعلق بھی یہ کہا جاتا رہا ہے۔ کہ ان کا تاریخی پہلو سقیم ہے۔ کہانی بہرحال کہانی —— انسان کے تھکے ہارے ذہن کے لئے تسکین اور ذوق و وجدان کے توازن کو بحال رکھنے کا ایک رومانی ذریعہ ہے ہمارے خیال میں مروجہ لوک کہانیوں یا مقامی داستانوں کا اس بے دردی کے ساتھ جائزہ لینا مناسب نہیں۔ ماحول اور معاشرے کی ضرورت ان کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ ان میں قوموں کے جذبات احساسات، عادات وخصائل، رہن سہن اور رسم و رواج کی تصویریں ہوتی ہیں اور پھر یہ داستانیں ایک مقدس قومی امانت کی طرح سینہ بسینہ چلی آتی ہیں۔

پٹھانوں کی 'لوک کہانیاں' بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان کو بھی تاریخ کی کسوٹی پر جانچنے سے ان کی ادبی، روایتی اور کلاسیکی حیثیت مجروح ہوگی۔ ان کا افادی پہلو یہ ہے کہ ہم ان کے ذریعے یہ اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ آج سے صدیوں پہلے کا پٹھان کیا تھا —— اس کا رہن سہن کس ڈھب کا تھا —— ان کے عادات وخصائل اور انداز معاش و معاشرت کس طرح کے تھے اور اس کے وسائل و ذرائع کیا تھے ——

اس مجموعے میں جن کہانیوں کو اردو کا لباس دیا گیا ہے۔ وہ ہو بہو اصل کا

ترجمہ نہیں۔ بلکہ کہانی کے مواد اور داستان ساز کے منشا کو افسانوی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ بعض مقامات ایسے بھی آ گئے ہیں جہاں مقامی رنگ، جوں کا توں قائم رکھا گیا ہے۔ اگر اس میں ردّ و بدل کیا جاتا تو شاید واقعیت مسخ اور حقیقت نگاری کا خون ہو جاتا۔ــــــ غالباً اردو ادب میں اپنے ڈھب اور انداز کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اسے سراہا گیا تو ہم اپنی سعی کو مشکور سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے۔

فارغ رضا

۱۵ رجون ۱۹۵۵ء

آدم، درخانئی

سوات کی فراخ و جوان وادی، سرسبز و شاداب چراگاہیں، اور نرگسوں سے معمور کھیت، آدم خاں کے ملکوتی نغموں میں ڈوبے ہوئے کھوئے ہوئے کسی جنت گم گشتہ کے حصے معلوم ہوتے جب آدم خاں کی راگ بھری انگلیاں رباب کے تاروں سے مس ہوتیں تو ساکت و خاموش تاروں میں جیسے ہزاروں حوریں گانے لگتیں، سینکڑوں کوئلیں اور پپیہے، ہجر و فراق کی داستانیں سنا سنا کر نرگستانوں میں آگ لگا دیتے جس سے سوات کی چراگاہیں افسردہ ہو جاتیں اور شاداب وادیوں کی جوانی جھلس کے رہ جاتی۔ پنگھٹ پہ جاتی ہوئی اُلھڑ دوشیزائیں راستہ چلنا بھول جاتیں، ان کے قدم رک رک جاتے، اور اکثر ان کے سروں اور کولھوں پر رکھے ہوئے پانی کے گھڑے زمین پر گر کر ان کے ارمانوں کی طرح چور چور ہو جاتے۔ ان کی رگ رگ میں رومانی گیتوں کا الاپ گدگدی کرنے لگتا، ان کی امنگیں زخمی پنچھیوں کی طرح رقصِ بسمل میں مگن ہو جاتیں۔

آدم خاں کے رس بھرے نغموں کے ساتھ اس کی بھرپور جوانی اور صدف ایسی آنکھوں کی چمک دمک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، کتابی چہرے کے دلکش نقوش اور شمشاد ایسے قد کی رعنائی کا شہرہ "باز درۂ بالا" کی حدود سے نکل کر سارے سوات

میں پھیل چکا تھا۔ سارا سوات اس گاؤں کی قسمت پر رشک کرنے لگا، لوگ کہتے :۔

حسن خاں ملک کتنا خوش نصیب ہے کہ اللہ نے اسے مال و دولت کے ساتھ ساتھ آدم خاں ایسا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ قبیلے کی آنکھ کا تارا!

آدم خاں۔ گاؤں کی ہر لڑکی کا محبوب۔ سینکڑوں کنواریوں کے دل اس کے رباب کے تاروں میں اُلجھے رہتے۔ لیکن آدم کو کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اسے اگر عشق تھا تو اپنے رباب سے وہ رباب کے تاروں کے ساتھ باتیں کرتا۔ نئی نئی باتیں، انوکھے راز و نیاز، اس کی انگلیاں ہر لمحہ تاروں کے ساتھ کھیلتی رہتیں، اس کی آواز ہر وقت کسی ابدی نغمے کے سراغ میں بھٹکتی رہتی۔ وہ آنکھیں بند کئے ہر وقت نغمے کے پُر شور سمندر میں بہے چلا جاتا۔ اپنی منزل متعین کئے بغیر کشتی، ساحل اور ناخدا سے بے نیاز، ایسی جل پری کی تلاش میں جو نغمے سے زیادہ دلکش اور زہرہ و مشتری سے زیادہ حسین و جمیل ہو۔ اس کے ذہن و تخیل پر ایک ایسی تصویر مرتسم ہو چکی تھی جسے وہ اپنے دل کی ملکہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ راز اس کے دل کے محلے میں پل رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کس سے کہتا؟ اسے کوئی راز دار نہیں ملتا تھا، وہ ہر لمحہ اس تخیلی پیکر کو نغموں کے خواب زاروں میں محوِ گلگشت دیکھتا۔ اسے خواب میں بھی اسی کا خیال آتا۔

ماں باپ، اپنے اکلوتے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جیتے۔ وہ اس کی شہرت اور تعریف سن کر اللہ کا شکر بجا لاتے۔ اب ان کے دل میں ایک آرزو تھی۔ آدم خاں کی شادی۔ لیکن آدم خاں کی شادی اس پیکرِ تخیل کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ماں باپ کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ آدم خاں کے انکار

کے پس منظر سے بے خبر تھے۔ انہیں آدم کے خیالی عشق کی خبر نہ تھی۔ اور جب آدم کے دور از داردوستوں نے انہیں اس راز سے آگاہ کیا کہ وہ تو اپنے خوابوں کی ملکہ کے ساتھ ہی شادی کریگا تو انہوں نے اس کو بڑے تعجب سے سنا، وہ سمجھے شاید آدم کو رباب نوازی کے بے پناہ شوق نے پاگل بنا دیا ہے۔

ایک دن جب آدم خاں رباب کے ساتھ رازدنیاز میں مصروف تھا۔ اس کے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں پڑیں جیسے کسی نے رس گھول دیا ہو۔ وہ ہمہ تن متوجہ ہو گیا۔ پڑوس کے گاؤں "باز درہ پایاں" سے آئی ہوئی مہمان بڑھیا اپنے گاؤں کی ایک لڑکی کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ طاؤس خاں کی اکلوتی مہ جبین لڑکی "درخانئ" کے حسن وجمال کی تفسیر میں محو تھی۔ آدم کو دیار محبوب سے آئی ہوئی ہستی سے ایک گونہ انس پیدا ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ تمام باتیں اسی کی محبوبہ کی ہو سکتی ہیں۔ اور پھر آدم نے بڑھیا کے سامنے "درخانئ" کے خدوخال بیان کرنا شروع کئے۔ جب اس نے بائیں رخسار کے تل اور پیشانی کے دلکش نشان زخم کا پتہ دیا تو بڑھیا نے قسم کھا کر کہا! آدم بیٹا! تم نے درخانئ کو ضرور دیکھا ہے" لیکن آدم نے کہا! "خالہ میرا خواب سچا ہے۔ میری محبت ازلی وابدی ہے۔ میرا عشق پاکیزہ ہے"

بڑھیا نے آہ سرد کھینچ کر کہا؛ "لیکن بیٹا! یہ سب کچھ بے سود ہے۔ درخانئ کی منگنی تو ایک خان پایاؤ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ بڑھیا کے ان الفاظ نے آدم کی دنیا تہ و بالا کر دی۔ اس پر دیوانگی نے اپنا سایہ ڈال دیا۔ رباب کے ساتھ اس کا انس بڑھ گیا، اب تو اس نے رباب کے تاروں کو زبان دے دی تھی!

کہتے ہیں عشق کی آگ دونوں طرف سلگتی ہے، بڑھیا واپس اپنے گاؤں

گئی تو اس نے درخانئی سے آدم خاں کے خوابوں اور اس کی بے پناہ محبت و شیفتگی کا ذکر کیا۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب درخانئی نے بھی جواباً بڑھیا کے سامنے اپنے خواب بیان کئے۔ آدم خاں کی شکل و صورت بتائی۔ اور اس کے رباب کے آتش ریز نغموں کا ذکر کیا۔

دُرخانئی ہر رات خوابوں کی سرسبز و شاداب وادی میں آدم کو کسی ندی کے کنارے رباب بدست دیکھتی۔ اور جب رباب کے نغمات اپنے عروج پر ہوتے تو درخانئی کسی اپسرا کی طرح آسمانی ناچ ناچتی ہوئی رباب کے ملکوتی نغموں میں گھل جاتی، اور جب آدم خاں رباب کے تاروں سے مضراب الگ کر لیتا۔ تو درخانئی اس میٹھے اور بہشتی خواب سے ایک دم بیدار ہو جاتی، اور پھر اس کے کانوں میں آدم کے ٹپوں کا الاپ اور نغمے پہروں گونجتے رہتے۔

جب آدم کو درخانئی کی محبت کا علم ہوا تو اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ لگا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں ہر لمحہ رباب بدست رہنے لگا۔ بڑھیا نے درخانئی کا پیغامِ محبت اور پھولوں کا تحفہ آدم خاں کو دیا۔ اور یہ خوشخبری بھی سنائی کہ وہ عنقریب ایک شادی کی تقریب پر یہاں آنے والی ہے۔

اور پھر شادی کی تقریب پر آدم نے اپنے فن نہیں بلکہ اپنے پرخلوص عشق، اپنے شوق و محبت اور سوز و گداز کا مظاہرہ کیا۔ ساری محفل پر جیسے کسی نے جادو کر دیا ہو۔ آدم و درخانئی کے خلوص و محبت کا جادو! —— اور جب درخانئی پر آدم کی نظر پڑی تو اس کے خواب و خیال کی شہزادی عالمِ ہوش و بیداری میں اور بھی نکھری ہوئی معلوم ہوئی۔ آدم کے جذباتِ شوق نے رباب کے تاروں میں جان

ڈال دی۔ اور اس نے محبوب کا گیت محبوب کے حضور بصدق شوق و نیاز پیش کیا۔

درخانئی کو ایک نظر دیکھ لینے کے بعد آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ اب اس کا علاج درخانئی کے پاس ہی تھا۔ اس کے راز دار دوستوں تھرد اور بابو سے اپنے دوست کی یہ حالت نہ دیکھی جا سکی۔ اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح آدم کو دیارِ محبوب میں پہنچا دیا۔ پھر ایک رات۔ تاروں بھری رات میں۔ محبت کے یہ دو پیکر اکٹھے ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال آنسوؤں کے موتیوں اور الکاوں کے ہاروں سے کیا۔ ٹھنڈی آہوں کے گیتوں سے ایک نے دوسرے کو خوش آمدید کہی اور ایک لمحے تک دونوں کی خاموشی نے ایک دوسرے کو خراج محبت پیش کیا۔ جب آہوں کے بادل چھٹے، اشکوں کا مینہ تھما۔ تو عشق و محبت کے یہ دو نوں افق مسکرائے:۔

میرے خوابوں کی شہزادی، تو آخر کب تک میرے خیالوں کی طرح آوارہ پھرتی رہیگی؟ آ نغموں کی طرح میرے رباب کے تاروں میں ڈھل جا! مضراب کی طرح میری انگلیوں کے پوروں میں پیوست ہو جا! اب جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔"

——" میرے مغنی محبوب! میں تیرے نغموں کی دنیا میں کھو جانے کے لئے بیتاب ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں، رباب اور نغمے کی طرح، مضراب اور تاروں کی طرح —— اے میرے چاند! دنیا میرے لئے تاریک رات کی مانند ہے۔ میں چکور کی طرح تجھے ہر طرف تلاش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن ہر قدم پر دام بکھرے ہوئے ہیں۔"

——لیکن درخو پیاری! تیری منگنی؟ تیرا بیاہ؟ کیا مجھ سے میرا رباب چھین لیا جائے گا؟ میرا گلا گھونٹ کر میرے ٹپوں اور الاپوں کو موت کی نیند سلا دیا جائیگا؟

کیا میرے نغمے بے سوز کر دیئے جائیں گے؟ کیا میرا رباب کسی جلا ہے کے حوالے کر دیا جائے گا؟ کیا یہ سچ ہے درخانئی؟ پیاری درخو؟"

——— میرے مغنی محبوب! بے سُرے نغمے گانے بند کر دے۔ کیا تجھے اپنے رباب پر اعتماد نہیں رہا؟ رباب کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بندوق بھی تو ہے جب مضراب سے کام نہ چل سکے تو اس کی جگہ کارتوس لے لیتے ہیں۔ یہی ایک یوسف زئی پٹھان کی جرأت و ہمت کا تقاضا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ مجھے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ رباب ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن اناڑی انگلیوں سے سُر نہیں کیا جا سکتا۔"

ستاروں کی گردش نے ہوا کے جھونکے کی طرح تاروں بھری رات کے دامن کو درہم برہم کر دیا! دو دلوں نے ابھی راز و نیاز ختم بھی نہ کئے تھے۔ کہ مرغ سحر نے اذان دی۔ درخانئی کے گھر کے صحن میں بندھی ہوئی بھیڑوں نے ممیانا شروع کر دیا۔ اور یہ دونوں متوالے ایک دم جیسے گہری نیند سے چونک اٹھے۔ درخانئی کے دل سے بھیڑوں کے لئے بد دعا نکلی:۔

"اے میرے باپ کی بھیڑو! تمہارے گلے میں ناسور پڑ جائے تم نے میرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا!"

دونوں نے آپس میں انگوٹھیوں کا تبادلہ کیا اور چاند سورج کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہو گئے!

اب تو یہ آگ دونوں طرف بھڑک اُٹھی تھی، اس کے شعلے آسمان گیر ہو چکے تھے۔ درخانئی بیمار ہو کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کا خیال تھا شاید اس طرح شادی کی بلا ٹل جائے گی۔ لیکن بڑی بوڑھیوں کا خیال تھا۔ کہ شادی ہونے سے درخانئی صحت یاب ہو جائے گی۔

اس طرح جس تیر سے اس نے شکار کرنا چاہا تھا۔ وہ اسی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔
ڈھول اور سرنا کی چیخیم دھاڑیں درخانئ کی ڈولی دوشیزگی کی لاش اور جوانی کا پارمان جنازہ تھا، وہ پرکٹی کونج اور زخمی مرغابی کی طرح ڈولی میں پڑی کراہ رہی تھی۔

نئے قفس میں جاکر وہ سچ مچ بیمار پڑ گئی۔ اور نادان طبیبوں نے سمجھا اسے تپ دق ہے۔ درخانئ خوب جانتی تھی۔ کہ یہ روگ دوا دارو سے نہیں ٹلے گا۔ وہ دل ہی دل میں طبیبوں کی عقل پر ہنستی اور کہتی! ٹھیک ہی تو کہتے ہیں طبیب! تپ دق ہی تو ہے، لیکن عشق کی تپ دق کا علاج ان کے بس کی بات نہیں۔ اور جب علاج معالجے نے کوئی اثر نہ کیا تو اسے میکے واپس بھیج دیا گیا۔

"درخانئ رقیب کے گھر جا چکی ہے"۔ اس خبر نے آدم کے ہوش و حواس برہم کر کے اسے دیوانگی کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ اس کا رباب چھن گیا تھا۔ اس کا مضراب چرا لیا گیا تھا۔ اس کی غیرت پر حملہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے جذبات کو بری طرح جھنجوڑا گیا تھا۔

"درخانئ سخت بیمار ہو کر میکے واپس آگئی ہے۔ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے!" اس دوسری خبر نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ آدم خاں کا بدنصیب باپ بیٹے کی حالتِ زار پر رات دن کڑھتا۔ آخر اس نے اپنے ایک قریبی دوست میرمائی کے ساتھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ درخانئ کو زبردستی حاصل کیا جائے۔ میرمائی اور حسن خاں نے ایک مسلح جمعیت کے ساتھ طاؤس خاں کے مکان پر حملہ کر دیا۔ بڑے کشت و خون کے ساتھ تدبیر کارگر ہوئی اور آدم کو گوہر مراد ہاتھ آگیا۔ لیکن تقدیر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اسے کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ دو دل مل بیٹھیں۔

جب طاؤس اور پایا آؤ نے دیکھا کہ جنگ و جدل کے ساتھ درخانئی واپس نہیں مل سکتی، تو انہوں نے مال و زر کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ اور میرائی باوجود امیر و زردار ہونے کے مایا کے جال میں پھنس گیا۔ اس نے سال ہا سال کی دوستی کو دولت پر قربان کر دیا، اس نے گویا آدم خان کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالا اور اس طرح درخانئی پھر واپس اسی رنگین قفس میں قید ہو گئی۔ اس کی بیماری بڑھ گئی، وہ ہر لمحہ آنسوؤں کے شیش محل بناتی جو دوسرے لمحے چکنا چور ہو جاتے لیکن ان کے ٹوٹنے کی آواز کوئی بھی نہ سنتا!

آدم خان کا رباب گم گشتہ ملنے کے بعد پھر کھو گیا، اور اب اس کی تلاش بے سود تھی۔ اگر وہ دوبارہ مل بھی جاتا تو محبت کی کوئل کو ذبح کرنے کے بعد اس سے گیت سننے کی کوشش اور افسردہ راکھ سے شعلۂ جوالہ کی تلاش کے مترادف تھا۔ لیکن آدم خان کے ساتھی میرو اور باؤ نے رباب گم گشتہ کو پھر تلاش کرنے کی ٹھانی، انہیں آدم کی زندگی بڑی عزیز تھی۔ انہیں اعتماد تھا کہ درخانئی، آدم کے آغوش میں ضرور آ جائیگی۔ اور اس طرح آدم کا ساکت و خاموش رباب ایک بار پھر سوات کے نرگستانوں کو ملکوتی داستانیں سنائے گا۔ شاداب چراگاہوں میں پھر سے سحر نغمہ راج کرے گا۔ ندیوں کی گنگناتی ہوئی روانی تھم جائے گی۔ اور ترنم ریز چکور اور دراج رباب کے تاروں کے دام میں اسیر ہو جائیں گے۔

دوسرے دن، میرو، باؤ اور آدم خان ملنگوں کا روپ دھارے دیار محبوب میں جا پہنچے۔ گاؤں کے باہر شہید کے مزار پر سارے دھونی رما کر

بیٹھ گئے۔ آن کی آن میں نئے درویشوں کی خبر جنگل کی آگ بن کر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ مزار پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ بیسیوں نامراد اور حاجتمندوں نے درویشوں سے دعائیں کرائیں۔ تعویذ گنڈے لئے اور نامرادِ محبت آدم خاں نے سب کے لئے دعائیں کیں۔ ہر ایک کی ڈھارس بندھائی۔ لیکن اس کے اپنے آنسوؤں کے تار کو بھی روکنے والا نہ تھا! اس کی ڈھارس بندھانے والا کوئی نہ تھا! اسے کسی نے ایسا عمل نہ بتایا، جس سے اس کی محبت کا خاموش رباب چہک اٹھتا۔ لیکن اس کی راز دار بڑھیا نے اسے تسلی دی! آدم خاں! پختون ہو، جوان ہو! ہمت سے کام لو درخانئی تمہاری ہی ہے، وہ ضرور تمہیں ملے گی!"

درویشوں اور ملنگوں کی آمد اور کرامات کا شہرہ طاؤس خاں تک بھی پہنچا۔ بڑھیا نے طاؤس خاں سے کہا! "خان! خدا اور اس کے درویشوں کے پاس بہت کچھ ہے کہتے ہیں یہ درویش بڑے پہنچے ہوئے ہیں! شائد ان کی دعا سے ہماری پھولوں کی ڈالی جیسی بچی پر اللہ رحم کر دے۔ وہ تو مردوں کو بھی زندہ کر دیتا ہے!"

جب طاؤس خاں راضی ہو گیا۔ تو بڑھیا نے درخانئی کو خوشخبری سنائی! "بیٹا! تمہارے اوڑھنی سے گرا ہوا گلاب کا پھول ابھی تمہارے ہاتھ آیا چاہتا ہے۔ اسے ہوشیاری سے اپنے بالوں میں سجا لینا۔ بڑے زور کی آندھی چل رہی ہے۔ اب کے اگر یہ پھول گر گیا۔ تو آئندہ کبھی اس کی ایک پتی بھی نہ پا سکو گی!"

دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ آدم خاں نرالی عقیدتیں لئے۔ درِ محبوب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت اس کا انگ انگ نغموں بھرا رباب بنا محبت کے گیت الاپ رہا تھا۔ وہ سبزے کو روندتا، پھولوں کو مسلتا، جھومتا

تھا، منزل شوق طے کرکے درخانئ کے سامنے جا پہنچا!

درخانئ، نرگسستان سوات کی نرگس بیمار، پژمردہ کلی، کملایا ہوا پھول، خزاں گزیدہ پتی، مرجھائی ہوئی ڈال، بستر پہ پڑی تھی! جب دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو انہوں نے ایک دوسرے کو آنسوؤں کے ہیروں کا ہدیہ پیش کیا، محبت کے چمکتے ہوئے ہیرے، پیار کے آبگینے اور ان آنسوؤں نے خموشی میں ایک دوسرے کو ہزاروں داستانیں سنا ڈالیں! درخانئ کی پھول ایسی جوانی آدم خاں کی روح میں کانٹا بن کر پیوست ہوگئی۔ اس کے دل میں ایک تیر لگا۔ معاً اس کا ہاتھ سینے کی طرف بڑھا اور اس نے اپنے دل کو تھام لیا۔ اس کی زبان نے اس کے دل کا ساتھ دیا، اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ وہ بے ہوش ہوگیا۔ طاؤس خان کی دوررس نگاہیں معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ تلوار کے ایک ہی وار میں آدم خاں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ لیکن بڑھیا نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور کہا: "دانشمندی کا تقاضا ہے کہ اس بات کو اسی جگہ دبا دیا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"!

آدم خاں کے حواس بجا ہوئے تو وہ ایک تاریک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ طاؤس خاں شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے گرج رہا تھا! "لڑکے! اسی وقت میرے گاؤں سے نکل جا!" آدم خاں کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیدیا ہو۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا سے پیاسا لوٹ جانے پر مجبور کیا ہو، بھرے گلزار سے اس نے اپنی پگڑی پر سجانے کے لئے ایک پھول توڑنا چاہا لیکن اس کے ہاتھ توڑ دیئے گئے! اور وہ اپنے گاؤں واپس آگیا۔ بلکہ وہاں لایا

گیا۔ آدم خاں نہیں بلکہ اس کا قالب بے جان! اس کی روح دیارِ محبوب میں تنکے کی طرح آوارہ پھرتی رہ گئی۔ اور جسم بے نغمہ رباب کی مانند حسن خاں کے گھر۔

اب اسے دنیا کی ہر چیز سے نفرت ہو چکی تھی، خوبصورت دنیا کی ہر رعنائی وزیبائی سے۔ حتیٰ کہ اپنے رباب سے بھی، اس کے نغموں سے بھی! اور جب ایک دن اچانک اس کی نظر رباب پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ اسے اپنا حریف سمجھنے لگا۔ اور فرطِ غیظ میں کلہاڑی کے ساتھ رباب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

آدم کی حالت روز بروز غیر ہوتی گئی۔ ماں باپ کی محبت نے یہ دکھ برداشت نہ کیا، لاکھ تدبیریں کیں، علاج معالجہ کرایا۔ گنڈے تعویذ سے کام لیا۔ لیکن آدم خاں کا مرض بیکراں ہوتا گیا۔ جب حسن خاں کو یقین ہو گیا کہ اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا حقیقی وارث اور اس کے قبیلے کا نگہبان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ تو وہ بہت مضطرب ہوا۔ اور یہ طے پایا کہ کسی نہ کسی طرح آدم خاں کو گاؤں کی حسین ترین لڑکی گلنار دکھائی جائے۔ ممکن ہے سوکھی ندی میں پانی آ جائے۔ آدم کے عشق کا بھڑکتا ہوا الاؤ ٹھنڈا پڑ جائے اور وہ درخانئی کو بھول جائے!

پنگھٹ کے رومانی ماحول میں نقرئی قہقہوں کے سنگیت کا ہجوم تھا۔ چوڑیوں کے مدھر نغمات میں کائنات ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سرخ و سفید باہوں کی کہکشانیں۔ مست، الھڑ لڑکیوں کا جھرمٹ اور اس میں گلنار کا مرمریں پیکر۔ جیسے نرگستانِ سوات کی شہزادی گھڑی دو گھڑی کے لئے نرگس کے شبستاں سے باہر ٹہلنے آ گئی ہو۔ لانبی لانبی، پتلی پتلی گندمی ہوئی سیاہ بانوں

کی میںنڈیاں۔ دھڑکتے ہوئے دل کی طرح لرزتا ہوا سونے کا پنیر دان، دلکش اور آب پر سجے ہوئے خودرو پھول، جس نے دیکھا مبہوت ہو گیا! لیکن آدم خاں کو گلنار کے جلالِ حسن نے بالکل متاثر نہ کیا۔ اس کا معیار حسن و محبت بہت اونچا تھا۔ فرشتوں کے تقدس اور حوروں کی صباحت سے بھی اونچا!

گلنار کے خدوخال اس کے جسم کے خطوط کی شوخ محرابیں اس کے تیکھے نقوش کی ایمان ربائی۔ کوئی چیز بھی آدم کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اس نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس کی محویت، خاموشی اور خود فراموشی کی دنیا میں کوئی انقلاب نہ آیا۔ نرگس کی ہر آنکھ میں اسے درخانئی ہی کی تصویر نظر آئی۔ لالۂ صحرائی کے احمریں پیالے میں درخو کھڑی اسے بلا رہی تھی۔ وہ ہر بار اس تخیلی پیکر کی طرف لپکتا اور ہاتھ پھیلا کر رہ جاتا۔ درخانئی فضا میں تحلیل ہو جاتی اور آدم کے سینے پر داغ چھوڑ جاتی۔ اور فضا کا ہر ذرہ نرگس کی آنکھ سے آدم کی دیوانگی کا تماشا کرتا۔

ہجر و فراق کے طویل لمحے طویل تر ہوتے گئے، آدم خان کی دیوانگی کا رنگ پختہ تر ہوتا گیا۔ آخر ایک دن بازدرہ میں اس خبر نے کہرام مچا دیا کہ "آدم خان مر گیا!" کسی نے کہا "ہمارا مغنی مر گیا" کسی نے کہا "عاشق صادق مر گیا" اور کسی نے کہا "شہزادی درخانئی کا رباب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا! اب کون نغمے سنائے گا؟"

بازدرہ میں نغمے مر گئے۔ اور بین زندہ ہو گئے! درخانئی رنگین پایوں والے پلنگ پر دراز، روئیں روئیں میں آدم خاں کو بسائے ہر لمحہ اسی کے خواب دیکھتی رہتی۔ بڑھیا اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ اپنے باپ طاؤس خاں کی بھری بستی

میں یہی ایک اس کی ہمدرد اور اس کے دکھ درد جاننے والی تھی۔ لیکن غریب بڑھیا کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس کے کہے پر کوئی کان ہی نہ دھرتا تھا۔ درخانئ کے لئے تو اس کی ماں کی ماممتا بھی مر چکی تھی، اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔ ماں کی ممتا پر اس کے باپ کے شملے کی غیرت اور قبیلے کی روایتی عزت غالب آ چکی تھی۔ اب درخانئ کا آخری سہارا اس کے خواب ہی تھے! اس نے خواب میں دیکھا۔

ایک بے حد خوبصورت باغ ہے: جہاں وہ سہیلیوں کے ساتھ سیر کر رہی ہے۔ یکایک باغ کے ایک گوشے سے رباب کے نغمے ابھرنے لگے۔ جب درخو نے اس طرف رخ کیا۔ تو سرو و شمشاد کے ہجوم میں ایک بڑے تالاب کے بیچ، چاندی کی کشتی میں آدم خان بیٹھا رباب پر درخو کے گیت گاتا دکھائی دیا۔ اس نے درخو کو دیکھ کر اپنی آغوش وا کر دی اور درخانئ جل پری کی طرح پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آدم کے آغوش میں کھو گئی۔ آدم نے کہا: "میں! درخو، اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ ہم اسی کشتی میں رہیں گے۔ یہیں اپنے لئے نیا گاؤں بنائیں گے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تالاب ایک سمندر میں تبدیل ہو گیا۔ ایک خوفناک طوفان آیا، اور کشتی الٹنے لگی۔ درخانئ نے ایک چیخ ماری اور جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے سرہانے بڑھیا کو پایا جو اسے تسلی دے رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے لپٹ کر رونے لگی میرا آدم کہاں ہے خالہ؟ اس کی کشتی ڈوبی تو نہیں؟"

بڑھیا نے کہا "درخانئ بٹیا! آدم خان، تمہارے ماں اور باپ کی ضد پر قربان ہو گیا! وہ اس دنیا سے چلا گیا! آدم نے تیرے فراق میں تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ درخو بیٹی؟ اور جیسے درخانئ کا کسی نے گلا گھونٹ دیا۔ اس کے

منہ سے صرف "آدم خاں" ! نکلا۔ اس نے اپنا سر تکئے میں چھپالیا ! ایک طویل لمحے تک جب اس نے سر نہ اٹھایا۔ تو بڑھیا کو فکر لاحق ہوئی۔ جب اس نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آدم خاں کے پاس جا چکی تھی !!

کہتے ہیں جب درخانئی کو قبر میں اتارا گیا تو تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا گویا قبر میں دو لاشیں جمع ہو گئی ہیں ! جب دوسری لاش کے منہ سے کفن ہٹایا گیا تو وہ آدم خاں کی لاش تھی !!

آدم خان اور درخانئی کا مزار آج بھی مرجع عوام ہے۔ آدم کے مزار کے درخت کی لکڑی کا مضراب نغمہ و موسیقی کے ہر شائق کی انگلیوں میں جادو بھر دیتا ہے

موسیٰ خان۔ گل مکئی

ندیوں کی روانی میں حرکت و عمل کا تسلسل زندگی کے عشر زا پہلوؤں کا ترجمان ہے۔ اٹھتی جوانیوں اور چڑھتی ندیوں میں صرف تمثیلی تعلق ہی نہیں، گہرا رابطہ بھی ہے۔ کہتے ہیں جوانیوں کا خمیر اچھلتی، کودتی، مچلتی اور چنگھاڑتی موجوں سے اٹھایا گیا۔ کہستانی سلسلوں کے نوکیلے کنگروں نے اس خمیر کو گوندھا۔ اس میں خارا تشگاف اثرات سموئے اس میں کیسلاپن رکھا۔ طوفان خیز دھارے کی منہ زوری اور گرداب کے رقص کے ساتھ ساتھ دلآویزی اور بے نیازی کے آب نمک نے اس خمیر کو تکمیل کے مراحل سے گزرنے میں مدد دی۔

کوہستانی ندیوں کی گھن گرج اور پہاڑی جوانیوں کا الھڑپن عشق وحسن دونوں کے خمیر کا جزو اعظم ہے ——— موسیٰ خان کے عشق اور گل مکئی کے حسن کا بھی زیر و بم ان کے رومانی افسانے کا باعث ہوا۔ کسے خبر تھی کہ پیین ترین گاؤں کا مدرسہ بھی لیلیٰ مجنوں کو جنم دیگا ——— پہاڑی ندیاں آج تک شاید اسی لئے فراز کوہ سے اترتے ہی اس گاؤں کے دامن میں سر تسلیم خم کر دیتی ہیں۔ اور اسکی تند و تیز موجیں موسیٰ خان اور گل مکئی کی محبت کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔

پیین ترین کی لیلیٰ، شاہ مست خان کی اکلوتی بیٹی گل مکئی، ملا شمس الاسلام کے مدرسے میں داخل کر دی گئی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ہجوم میں گل مکئی آفتاب و

ماہتاب کی طرح درخشندہ و تابندہ تھی۔ گل مکئی کا چچا زاد سہیل جو اس کا منگیتر بھی تھا۔ اسی مدرسے میں سبق پڑھتا تھا۔ لیکن سہیل اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ گل مکئی مدرسے کی روح تھی۔ تمام طالب علم اس پر جان چھڑکتے ــــ اور پھر ایک دن اس مدرسہ میں ایک نیا طالب علم داخل ہوا۔ یوسف زئی قبیلے کی آنکھ کا تارا موسیٰ خان ــــ عیسیٰ خان کا اکلوتا بیٹا۔ اس کے ملک و مال کا تنہا وارث۔ صوابی کے خطے کا واحد حکمران ــــ

موسیٰ خان نے جوں ہی مدرسہ میں قدم رکھا ــــ گل مکئی کے انگ انگ نے اسے قبول کر لیا۔ اس کی نظریں کتاب کی بجائے موسیٰ خان کے خط و خال پڑھنے لگیں۔ وہ اپنی نقرئی انگلی اپنے موتیوں جیسے چمکیلے دانتوں میں دبائے ہکا بکا رہ گئی ــــ موسیٰ خان کے آنے سے مدرسے میں چہل پہل نظر آنے لگی۔ وہ بڑا ذہین، جاذب نظر اور ملنسار تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا مدرسہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ خصوصاً گل مکئی اس پر ہزار جان سے فدا تھی۔ ادھر موسیٰ خان کو بھی اس کے بغیر چین نہ پڑتا ــــ اب یہ دونوں اس مدرسے کے ہیرو اور ہیروئن تھے۔ اور جب ان کی محبت نے عروج حاصل کر لیا تو وہ صرف مدرسے ہی کے نہیں، دنیائے عشق کے بھی ہیرو ہیروئن بن گئے۔ وہ روز بروز قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوتے۔

ایک دن موسیٰ خان اور گل مکئی ندی کے کنارے کھیل میں مصروف تھے۔ سہیل بھی ان کے ہمراہ تھا ــــ الھڑ جوانی انجام سے بے خبر ہو کر دوڑی تو تیز رو ندی کی تند موجوں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ٹھاٹھیں مارتی ہوئی ندی کا بہاؤ اور نازک اندام گل مکئی ــــ سہیل تو بچاؤ بچاؤ کہتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا۔ لیکن

موسیٰ خان ندی کے خونی دھارے کے جبڑوں سے گل مکئی کو نکال کر صحیح سلامت کنارے پر لے آیا — جب وہ باہر نکلے تو کنارے پر سارے گاؤں والوں کو کھڑا پایا —
شاہ مست خان نے موسیٰ خان کو گلے لگا لیا۔ "میرے بہادر پٹھان بیٹے تم سے یہی امید تھی۔ تم نے میری بیٹی کو زندگی بخشی" — سب لوگ موسیٰ خان کی بہادری اور جرأت کی تعریف کر رہے تھے۔ سہیل مارے شرم کے پانی پانی ہو رہا تھا۔ اب موسیٰ خان اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ وہ اسے اپنا رقیب سمجھنے لگا۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لئے اس نے موسیٰ خان سے کہا کہ اڑتی چڑیا غلیل سے مار دکھائے — وقت سے پہلے ہی اس مقابلے کے چرچے ہونے لگے۔ اور آخر ایک دن چھٹی کے بعد میدان میں ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ سہیل نے غلیل میں پتھر چلایا — ایک، دو، تین — لیکن تینوں نشانے خطا گئے اور تینوں مرتبہ چڑیا صحیح سلامت فضا میں دائرے بناتی ہوئی افق کو چھونے کے لئے اونچی بہت اونچی اڑ گئی۔

گل مکئی کا دل دھڑکنے لگا۔ تمام طالب علموں کے چہرے فق ہو گئے۔ اور وہ موسیٰ خان کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگنے لگے۔ سب کی دلی آرزو تھی کہ موسیٰ خان کا نشانہ خطا نہ ہو — گل مکئی نے ایک سفید پتھر اٹھا کر اسے چوما اور پھر اس پر بسم اللہ دم کر کے موسیٰ خان کو تھما دیا — دوسرے ہی لمحے ایک خاکستری چڑیا فضائے بسیط سے زمین پر گر کر تڑپنے لگی — لڑکوں نے موسیٰ خان کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ خوشیاں منائی گئیں۔ گل مکئی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔

سہیل کی شکست نے جذبۂ رقابت کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ آخر اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے اپنی ماں کو گل مکئی

اور موسیٰ خان کی محبت کا قصّہ خوب نمک مرچ لگا کر سنایا۔ اس بڑھیا نے جا کر گل مکئی کی ماں کو بھڑکایا ــــــ شاہ مست خان نے جب گل مکئی کی ماں کی زبانی یہ اُلٹی سیدھی باتیں سنیں تو آگ بگولا ہو گیا۔ اور اسی دن سے گل مکئی کو مدرسے بھیجنے کی ممانعت کر دی۔

پیین تیرین کی خوش نوا عندلیب کو شاہ مست خان نے قفس میں بند کر دیا۔ موسیٰ خان بھلا اس وحشت اثر خبر کی کب تاب لا سکتا تھا۔ مدرسے سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ گل مکئی کے بغیر مکتب کے در و دیوار اسے کاٹنے کو دوڑتے۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا۔ اور اپنی محبوبہ کی یاد میں رات دن آنسو بہاتا اور آہیں بھرتا۔ ملاقات کی کوئی صورت نہ تھی۔ آخر ایک ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ اس نے گل مکئی کی کنیز سلارو کو بہلا پھسلا کر خط لے جانے پر رضامند کر لیا۔ جب وہ خط کا جواب لائی تو موسیٰ خان سے ضبط نہ ہو سکا۔ خط کے ہر ہر لفظ میں عشق و محبت کے متلاطم سمندر بند تھے۔ وہ بار بار خط کو پڑھتا، چومتا، آنکھوں سے لگاتا۔

خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو دونوں بے قرار دل کچھ اطمینان حاصل کرنے لگے۔ لیکن بات آخر کب تک راز میں رہ سکتی۔ عشق تو پارے کی طرح اپنا راستہ آپ بنا لیتا ہے۔ ایک دن موسیٰ خان نے گل مکئی کے نام محبت نامہ لکھ کر اپنی کتاب میں رکھا تاکہ سلارو کے ذریعے اسے بھجوائے۔ مدرسے سے واپسی پر وہ لفافہ کہیں راستے ہی میں گر گیا۔ اور بدقسمتی سے مہیل کے ہاتھ لگا۔ وہ تو یہ چیز خدا سے مانگتا تھا۔ بھاگا بھاگا شاہ مست خان کے ہاں پہنچا اور یہ خط اسے دکھا کر کہا۔ "خان معاملہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ جلد کوئی تدبیر کیجئے ورنہ ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔" ــــــ شاہ مست خان پہلے ہی کافی مشتعل تھا۔ اس خط نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ طے پایا کہ موقع پا کر موسیٰ خان کو مدرسے ہی میں قتل کر دیا جائے۔ کہیں سلارو کو اس سازش کا پتہ چل گیا۔ اور اس نے وقت سے پہلے

ہی موسیٰ خان کو اپنے گاؤں بھجوا دیا۔

شاہ مست خان مع اپنے ہمراہیوں کے جب مدرسے پہنچا تو وہاں موسیٰ خان کو نہ پاکر نہایت برافروختہ ہُوا اور اس کے گاؤں پر شبخون مارنے کا منصوبہ تیار کیا۔ لیکن شاہ مست خان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے رات کے سناٹے میں موسیٰ خان کو ایک لشکر جرار کے ساتھ مقابلہ کے لئے مستعد پایا۔ گاؤں کے باہر میدان میں گھمسان کا رن پڑا۔ اور جب شاہ مست کو اپنی ہار کا یقین ہو گیا۔ تو اسے پسپائی ہی میں عافیت نظر آئی بہیل گرفتار کر لیا گیا۔ موسیٰ خان نے اسے قتل کرنا چاہا۔ لیکن اس نے بڑی منت سماجت کی اور اپنی وفاداری کا یقین دلا کر مخلصی حاصل کی۔

اس خونین واقعہ کو ایک عرصہ گزر گیا۔ بڑے بوڑھوں نے شاہ مست خان اور عیسیٰ خان کے درمیان صلح صفائی کرا دی لیکن اس سے موسیٰ خان اور گل مکئی کی محبت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ دونوں آتش فراق میں جلتے رہے، دو بیقرار دلوں کے ملنے کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ وہ ضرور ملیں گے۔ ضرور کامیابی سے ہمکنار ہونگے۔ وہ خلوص دل سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت بھی ان کے اس رشتے کو توڑ نہیں سکتی تھی۔

ایک دن موسیٰ خان کا چرواہا بکریاں چراتا ہوا شاہ مست خان کے گاؤں کی طرف نکل گیا۔ بہیل کی نظر اس پر پڑی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے چرواہے کو بری طرح پیٹا اور گاؤں سے نکال دیا۔ یہ چرواہا موسیٰ خان کے پاس شکایت لے کر گیا۔ موسیٰ خان سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور تلوار سونت کر چل پڑا۔ بہیل ابھی کھیتوں ہی میں تھا کہ اسے جا لیا۔ قریب تھا کہ موسیٰ خان کی تلوار اسے کیفر کردار کو پہنچا دے۔ کہ اس نے

موسیٰ خان کے پاؤں پر سر رکھدیا۔ اور قسم کھا کر کہنے لگا میں نے چروا ہے کو پہچانا نہیں۔ اس شریف دِل بہادر نے ایک دفعہ پھر اپنے رقیب کی جان بخشی کر دی۔

اس واقعہ نے دونوں طرف کے بڑے بوڑھوں کو پھر سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن اب کے معاملہ اتنا سنجیدہ ہو چکا تھا۔ کہ کسی کی بھی کچھ پیش نہ چلی ــــ شاہ مست جو پہلے ہی اپنی شکست کا بدلہ لینے کے بہانے ڈھونڈھ رہا تھا۔ سہیل نے اسے کچھ اس رنگ میں یہ واقعہ سنایا کہ وُہ سہیل کے ساتھ گل مکئی کی شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔ برات کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اس میں تنہا موسیٰ خان کو مدعو کیا گیا اور طے پایا کہ عین برات کے ہنگامے میں اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

گل مکئی کا عاشق صادق ان سازشوں سے بھلا کب بے خبر رہ سکتا تھا۔ اس نے دعوت منظور کر لی۔ اور بظاہر اکیلا ہی شمولیت کے لئے آیا۔ لیکن درپردہ اس کے ساتھ بڑے جرار جانبازوں کا ایک دستہ بھی تھا جو کیل کانٹے سے لیس باہر کھیتوں میں اپنے سردار کے اشارے کا منتظر تھا۔

شادی کی تاریخ کا تعین گل مکئی کے لئے پیغام مرگ تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ وہ دل ہی دل میں خودکشی کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ کہ اچانک سلارو نے آکر اس کے کان میں کوئی ایسی بات کہی کہ گل مکئی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کا دِل خوشی سے جھومنے لگا۔ اور وہ مستقبل کے حسین و جمیل سپنوں میں کھو گئی۔

شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ حجرے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ بجتی ناچ ہو رہا تھا۔ لوگ باگ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دھن لٹا رہے تھے۔ سوکھے تمباکو کے حقے کا دور چل رہا تھا جس کے کڑوے دھوئیں نے حجرے کی فضا کو مکدر

بنا رکھا تھا۔ نسوار کی ڈبیوں کے منہ کھلتے اور بند ہوتے اور ہر لمحے لوگوں کی نسوار بھری چٹکیاں ہونٹوں اور باچھوں میں کھلتیں۔

موسیٰ خان بڑے وقار و تمکنت کے ساتھ ایک طرف نہایت چوکنا بیٹھا ہوا تھا۔ جب رقص و سرود کا ہنگامہ پورے عروج پر پہنچا۔ تو وہ آہستہ سے اٹھا اور نظریں بچا کر حجرے سے باہر نکل گیا ـــ شاہ مست کے برجوں والے مکان کے پچھواڑے اس نے گل مکئی کو چشم براہ پایا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سالار و بولی۔ بی بی یہ باتوں کا وقت نہیں جلدی کیجئے ـــــ موسیٰ خان کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

شام کی تاریکی میں شاہ مست خان کے گھر سے نالہ و فغاں کا ایک شور اٹھا۔ ڈھول اور شہنائی ایک دم خاموش ہو گئے جیسے کسی نے ان کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ کسی نے آ کر کہا "دلہن غائب ہو گئی" ـــ یہ خبر سنتے ہی ساری محفل پہ سکتہ چھا گیا ـــ سہیل نے حجرے میں نظر دوڑائی، موسیٰ خان بھی غائب تھا۔ وہ فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

موسیٰ خان کے گھوڑے نے بڑی مستعدی دکھائی اس کے روئیں روئیں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ جس سے زمین پر پسینے کی ایک لکیر سی بن گئی۔ جیسے کسی کھوجی نے ان کی تلاش میں نشان کھینچ دیئے ہوں۔ لیکن گھوڑے کی ہمت کام نہ آئی تاریکی بڑھ چکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑے پتھر سے ٹھوکر لگی اور گھوڑے نے گرتے ہی دم توڑ دیا ـــ موسیٰ خان نے گل مکئی کو ایک گھنے درخت کی آڑ میں چھپا دیا۔ اور خود ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ شاہ مست اور سہیل سر پر آن پہنچے۔ موسیٰ خان تلوار نکال کر دشمنوں سے گتھ گیا۔ اس نے تن تنہا کافی مقابلہ کیا۔ لیکن آخر حریف کی ایک ضرب کاری نے اسے زمین پر گرا دیا۔

بہیل نے بڑھ کر تلوار کے ایک ہی وار سے کام تمام کرنا چاہا۔ کہ گل مکئی نے درخت کی آڑ سے ایک پتھر اٹھا کر مارا۔ بہیل کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ گل مکئی نے جلدی سے بڑھ کر تلوار اٹھالی۔ اور ایک ایسا بھرپور وار کیا۔ کہ بہیل نیم بسمل ہو کر تڑپنے لگا۔ اسی اثنا میں موسیٰ خان کے جانباز بھی اس کی کمک کو آپہنچے۔ پھر تو وہ رن پڑا کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اور شاہ مست کو اپنے بچے کھچے ہمراہیوں سمیت بھاگتے ہی بنی ——

گل مکئی اپنے زخمی محبوب کے سرہانے بیٹھی اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ اس نے ہزاروں منتیں مانیں، دعائیں کیں اور آخر وہ دن آیا۔ جب موسیٰ خان نے غسل صحت کیا۔ وہ گل مکئی کے ساتھ پائیں باغ میں بیٹھا اختلاط کر رہا تھا۔ گل مکئی گلاب کے پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ وہ چکور کی طرح اپنے چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی —— موسیٰ خان نے باتوں باتوں میں گل مکئی سے شادی کی بات چھیڑی۔ تو اس نے ایک کڑی شرط کا بھاری پتھر لڑھکا دیا۔ "تمہیں میرے باپ کو راضی کرنا ہوگا۔" یہ سنتے ہی موسیٰ خان پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس نے کہا۔ یہ بڑی مشکل شرط ہے۔ شاہ مست خان کبھی نہ مانے گا —— "کچھ بھی ہو اسے راضی کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ یہ کانٹا ہمیشہ میرے دل میں پیوست رہے گا۔ اور ہماری خوشی ادھوری رہ جائے گی۔"

آخر موسیٰ خان کو اپنی محبوبہ کی ہٹ کے سامنے جھکنا ہی پڑا وہ ریاست کے بڑے بااثر بزرگوں کا جرگہ لے کر شاہ مست خان کے ہاں پہنچا۔ اس کے باپ نے کہا: "شاہ مست خان! عیسیٰ خان اپنی ہار مانتا ہے۔ میں تم سے موسیٰ خان کی زندگی کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ اسے اپنی فرزندی میں لے لو"

قومی جرگے کی درخواست کو شاہ مست خان رد نہ کر سکا۔ اس نے موسیٰ خان کو

اپنے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

یوسف زئی قبیلے کی آنکھ کا تارا موسیٰ خان اور پینین ترین کی لیلیٰ وش گل مکئی حجلۂ عروسی کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک ایک گوشے سے سلاّرو کی تحکمانہ آواز آئی "ٹھہرو! میرا انعام دیتے جاؤ" ——— انھوں نے سلاّرو کی اس شرارت آمیز حرکت پر ایک پر زور قہقہہ لگایا۔ گل مکئی نے آگے بڑھ کر سلاّرو کے رخسار پر ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے کہا ———

"یہ رہا تمہارا انعام"

فتح خان، رابیا

اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ خدا کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ مال و منال، جاہ و جلال، ملک و سلطنت ——— لیکن پھر بھی اس کے چہرے پر ہر وقت افسردگی چھائی رہتی اور دل غم و رنج کے منوں بوجھ تلے دبا رہتا۔ زر و جواہر کی فراوانی قندھار کی اتنی بڑی سلطنت کی حکمرانی اور بست کے فولادی قلعہ کی صاحبقرانی ——— غرض کوئی چیز بھی اس کے دل کو اطمینان کی دولت اور انعام کی نعمت نہ دے سکی۔ تخت و تاج کے وارث کی عدم موجودگی اس کے لئے سوہان روح سے کم نہ تھی ——— اس کا یہ احساس نقطۂ عروج پر اس وقت پہنچا۔ جب اسے آئینے میں ایک دن اچانک اپنی سیاہ لمبی اور گھنی داڑھی میں ایک سفید بال نظر آیا۔ اب تو اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ کہ اسے یونہی بے نیل مرام اس دنیا سے کوچ کرنا پڑے گا۔ اس کے تخت و تاج پر لوگ قبضہ کر لیں گے۔ اور اسکی موت کے بعد کوئی اس کا نام لینے والا بھی باقی نہ ہوگا

اس احساس نے اسے زندگی سے مایوس کر دیا۔ اس نے سلطنت کا کاروبار وزیروں کو سونپ دیا۔ محل سرا کے خلوت کدے اور شبستان کو ترک کر کے ڈیوڑھی میں اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔

خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ایک دن ایک فقیر نے آکر محلسرا کے دروازے پر صدا دی۔ ملازمین نے حسب دستور خیرات اس کے کشکول میں ڈالنا چاہی لیکن وہ فقیر کچھ اور ہی ڈھنگ کا نکلا۔ اسے خیرات کی حاجت نہیں تھی۔ وہ تو براہ راست بادشاہ سلامت سے ملنا چاہتا تھا۔ ملازمین نے شاہ کی خدمت میں اس فقیر کی درخواست پیش کی۔ لیکن شاہ نے ملنے سے انکار کر دیا ـــــ فقیر کو یہ حال معلوم ہوا تو اس نے بہ آواز بلند کہا ـــ " مجھے مال و دولت نہیں چاہیئے۔ میں بادشاہ سلامت سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس بادشاہ سے جس کا نام اسلم خان ہے "

یہ بات شاہ کے کانوں تک پہنچی تو وہ آگ بگولا ہو کر بولا " کون گستاخ ہے جو ہمارا نام لے کر پکارتا ہے۔ حاضر کرو اس بے ادب کو " ـــــ فقیر کو فوراً حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے بڑے جلال کے ساتھ اس بے ادبی کا سبب پوچھا۔ فقیر بولا " بادشاہ سلامت میں ان فقیروں میں سے نہیں جو سونے چاندی کی بھیک مانگتے ہیں۔ میں بے فیض گداگر نہیں جو صرف پیٹ بھرنا جانتا ہو۔ میں تم سے کچھ لینے نہیں آیا بلکہ دینے آیا ہوں۔ میں تمہاری مایوسی کا علاج کرنے آیا ہوں۔ میں تمہیں زندگی دینے اور زندہ رہنے کا طریقہ سکھانے آیا ہوں، اے غمزدہ انسان ـــــ مانگ کیا مانگتا ہے۔"

شاہ فقیر کی اس بیباکی اور جرأت سے بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ فقیر کے لئے کرسئ زرنگار لائی جائے۔ لیکن فقیر نے چیخ کر کہا۔ " ہم خانہ بدوش لوگ بیٹھنے کے عادی نہیں۔ ہم نے حرکت میں زندگی پائی ہے۔ ہماری آواز فقیرانہ ہے اور ہم صدا دے کر چل دیتے ہیں۔ زمین اور ملک اللہ کے ہیں۔ اور اس کے تمام بندے اس کے مالک ہیں۔ سن اے شاہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تو کیا چاہتا ہے۔ مایوسی مردوں کا شیوہ

نہیں۔ یہ ہے میرا عصا اور باغ میں جا کر سیبوں کے درخت پر اس عصا سے ضرب لگا
جتنے سیب پہلی ضرب میں گریں، اٹھا لاؤ۔ ان میں سے ایک اپنی بیوی کو کھلاؤ۔ اور باقی
جسے چاہو دے دو۔ تمہاری دلی مراد فوراً بر آئے گی۔" یہ کہہ کر فقیر رخصت ہو گیا۔ بادشاہ
تھوڑی دیر مبہوت بیٹھا سوچتا رہا۔ آخر فیصلہ کیا کہ فقیر کے فرمودے کو آزما کر دیکھنا چاہیئے
کیا عجب ہے کہ خدا اسی بہانے اس نخل خشک کو بار ور کر دے۔ وہ یہ سوچ کر اٹھا۔ عصا
لے کر باغ گیا۔ اور جس طرح فقیر نے کہا تھا۔ اسی طرح عمل کیا۔ اس طرح اسے سات سیب
ہاتھ آئے۔ محل میں آکر ایک سیب بیوی کو کھلایا۔ دوسرا لونڈی کو، تیسرا وزیر کی بیوی
کو اور باقی امرا اور اعیان سلطنت میں بانٹ دیئے۔

خدا کی قدرت دیکھئے جس جس نے یہ سیب کھائے ان سب کی امیدیں بر آئیں۔
بادشاہ یہ خبر سن کر پھولے نہ سمایا۔ اس میں زندگی نئے سر سے عود کر آئی۔ وہ امور
سلطنت میں پھر سے پوری دلچسپی لینے لگا۔ اور پھر آخر وہ دن آیا جبکہ ساری مملکت
میں یک وقت سات بچے پیدا ہوئے۔ بادشاہ سلامت کے ہاں لڑکا تولد ہوا جس کا
نام فتح خان رکھا گیا۔ لونڈی کے بچے کا نام کرم خان اور وزیر کی بیوی کے بطن سے جو
چاند سی بچی پیدا ہوئی اس کا نام راتیا تجویز ہوا۔ ان کے علاوہ باقی تمام امرا کے گھر میں
لڑکے ہی لڑکے ہوئے۔

اس خوشی میں سارے شہر میں چراغاں ہوا اور جشن منایا گیا۔ تین دن تک شہر کے
لوگ بادشاہ کے مہمان رہے —— اور شاہ نے حکم دیا کہ تمام بچوں کی پرورش شاہی
خزانے سے کی جائے۔ اور ان کے لئے ایک الگ مکتب کھولا جائے۔ چنانچہ ان سب
کی تعلیم و تربیت ایک ساتھ ہونے لگی۔ یہ سب ایک ہی جگہ رہتے، پڑھتے، گھومتے

کھیلتے ـــــ فتح خان کو ان میں ایک سردار کی حیثیت حاصل تھی۔ کرتے فتح خان کا سوتیلا بھائی بھی تھا اور اس کا مزاج دانی ہی ـــــ وہ بڑا شریر تھا۔ عجیب عجیب اور خطرناک قسم کی شرارتیں کرتا۔ اکثر اوقات اس کی شرارتیں شہزادے اور دوسرے ساتھیوں کو بدنام کرتیں ـــــ ایک دن اسے ایک شرارت سوجھی۔ اور اس شرارت میں سب کو شریک کر لیا۔ سب کے لئے غلیلیں مہیا کیں اور پنگھٹ سے ذرا پرے سب کو چھپا کر بٹھا دیا۔ جونہی کنواری لڑکیاں پانی بھرنے آئیں۔ اس نے سب کو غلیلوں میں پتھر جانے کو کہا ـــــ کچھ دیر تک تو دوشیزہ لڑکیوں نے آپس میں چہلیں کیں۔ ان کی چوڑیوں کے ساز بجتے رہے۔ آپس میں پانی کے چھینٹے لڑتی رہیں۔ اور جب پانی بھر کر انہوں نے گھڑے سروں پر رکھے تو کرتے نے سب کو حکم دیا کہ غلیلوں سے گھڑوں کو نشانہ بناؤ۔ اور تڑاق تڑاق کرتے ہوئے دوشیزہ لڑکیوں کے سرخ سرخ گھڑے ٹوٹ گئے۔ اور وہ پانی میں شرابور ہوگئیں۔ ان کے سرخ و سیاہ لباس بدن پر چپک گئے۔ اور وہ چیختی چلاتی بھاگ گئیں۔ کرتے خوب لطف اندوز ہوا۔

شہر کے لوگوں نے بادشاہ سے شکایت کی ـــــ بادشاہ بڑا خفا ہوا لیکن سوائے تنبیہہ کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ لڑکیوں کو مٹی کے گھڑوں کے بدلے چمڑے کے گھڑے بنوا دیئے گئے۔ اب کے کرتے کو یہ شرارت سوجھی کہ اپنے ساتھیوں کے لئے غلیلوں کی جگہ تیر کمان مہیا کئے۔ اور جب پنگھٹ پر دوشیزہ، جوان اور مست تھتھوں کے آبگینے ٹوٹے ـــــ اور مٹیاروں نے گیت گائے :۔

"آج ہمارے گھڑے غلیلوں کا کس بل نکال دیں گے ہ ہمارے گھڑے پتھروں کا منہ موڑ دینگے

آج ہمارے دشمن منہ کی کھائینگے۔ اگر ان میں شرم ہو تو وہ پنگھٹ کے پانی میں ڈوب مریں۔ یہ پانی اُن کے لئے آئینہ عبرت ہے۔" اور پھر ایک اجتماعی قہقہے کے بے شمار نقرئی گھنگھرو چھن چھنا اُٹھے ـــــ سرخ و سفید باہوں کی کہکشاؤں نے گھڑے اپنے سروں پر رکھے ہی تھے کہ ایک دم بے شمار تیر گھڑوں میں پیوست ہو گئے ـــــ "اولیٰ اللہ" کی معتقد روحانی پیشوا نے کرتے اور اس کے ساتھیوں کو بڑا محظوظ کیا۔

فتح خان اور رابیا بچپن ہی میں گھل مل گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہوتے۔ ان کے اس گہرے ملاپ کے چرچے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ وہ انہیں شیریں فرہاد کے نام سے یاد کرتے ایک دفعہ رابیا بیمار ہوگئی۔ تو فتح خان کے ہوش و حواس کھو گئے۔ وہ اس کی چارپائی کی پٹی سے جدا نہ ہوا۔ کرتے نے بہتیرے طنز بھرے نشتر پھینکے ـــــ "یہ بھی کوئی مرد ہے؟ جو عورت کے لئے گھل رہا ہے۔ تم جیسے دو چار رفیق جوان اور پیدا ہو جائیں تو بس دنیا غارت ہوکر رہ جائے۔ لیکن فتح خان کی محبت چٹان تھی اس پر کرتے کی جونک نہ لگ سکی ـــــ محبت کی آگ دونوں طرف سلگ رہی تھی۔ رابیا بھی اسے دیکھے بغیر ایک لمحہ نہ گذار سکتی۔ ایک دفعہ جب فتح خان نے شکار سے واپس آنے میں دیر لگائی۔ تو رابعہ بے چین ہوگئی۔ گھوڑا منگوایا اور فتح خان کی تلاش میں جانے لگی کہ اتنے میں دور سے گرد و غبار کا ایک غلیظ بادل اُٹھا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں فتح خان کا مشکی گھوڑا پسینے میں شرابور نمودار ہوا۔

بچپن کے بھولے بھالے دن بہار کے ہلکے پھلکے لموں کی طرح بیت گئے۔ اور شباب کے قیامت خیز موسم نے رابیا کے آنگن میں قدم رکھا۔ فتح خان کی امنگوں

نے بھی انگڑائیاں لیں۔ دونوں کی آنکھوں میں محبت و اُلفت کے نشیلے ڈورے کھنچ گئے۔ دل ہزاروں افسانوں سے لبریز ہو گیا۔ کئی نامعلوم جذبات نے گدگدانا شروع کر دیا۔ رسم و رواج کی دیوار دونوں میں حائل ہو گئی۔ اور رابیا کو دستور کے مطابق پردہ نشین ہونا پڑا ۔۔۔ کیونکہ وہ اب جوان ہو چکی تھی۔ اور اس کے لئے غیر مردوں کے سامنے بے پردہ آنا معیوب تھا۔

رابیا کے ساتھ فتح خان کے حد سے بڑھے ہوئے رابطے سے نہ تو اس کی ماں خوش تھی اور نہ ہی باپ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی بھتیجی نازنین کو بہو بنا کر گھر لائے اور بادشاہ کی چونکہ اپنے وزیر کے ساتھ بنتی نہیں تھی۔ لہٰذا وہ نہیں چاہتا تھا کہ رابیا اس کی بہو بنے ۔۔۔

کرتمے جب رابیا کو دیکھتا تو اس کے سینے پر سانپ سے لوٹ جاتے۔ وہ اس پر دل و جان سے فدا تھا۔ لیکن اس میں اظہار کی جرأت نہ تھی۔ اور اگر وہ ایسا کر بھی دیتا تو منہ کی کھاتا ۔۔۔ وہ اندرونی طور پر محبت کے دو پیکروں کو جدا کرنے کے لئے سازشیں کرنے لگا۔ فتح خان کی ماں نے کرتمے کو غنیمت سمجھا۔ اس نے سوچا ۔۔۔ کرتمے ہی ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتا ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ کرتمے کی کوشش سے فتح خان نازنین کا ہو سکتا ہے ۔۔۔

اور پھر دونوں کے گٹھ جوڑ نے فتح خان اور رابیا کے راستے میں سازشوں کے جال پھیلانے شروع کر دیئے ۔۔۔ فتح خان کی ماں نے نازنین کو اپنے ہاں مہمان بلایا اور اس نے جو پارٹ ادا کرنا تھا اس سے بھی اسے آگاہ کر دیا گیا۔ ۔۔۔ یہ سازش کی طرف پہلا قدم تھا۔ اور جب وہ مہمان بن کر آئی تو کرتمے نے فتح خان سے کہا ۔ "بھائی جان سنا ہے نازنین لاکھوں میں ایک ہے؟ ذرا ہمیں۔ نظر سے دکھا تو دو"۔ لیکن فتح خان تو کسی اور

کے تصور میں محو تھا۔ اس نے سنی ان سنی کر دی ــــــ لیکن کرتے کب ہار ماننے والا تھا۔ چار و ناچار وہ کرتے کے ساتھ باغ گیا ــــــ جب وہ باغ میں داخل ہوئے۔ تو نازنین بصد ناز و ادا ــــــ پھولوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس نے جونہی فتح خان کو دیکھا تو بڑے انوکھے انداز سے سلام کیا ــــــ لیکن فتح خان نے اس کی طرف اعتنا نہ کی ــــ بلکہ اُلٹے پاؤں واپس ہونے لگا۔ کہ اتنے میں نازنین نے ایک چیخ ماری ــــ "اوئی کانٹا" ــــــ اور فتح خان گھبرا کر دوڑا دوڑا آیا۔ نازنین کو مخملیں سبزے پر لٹا کر اس کا سر زانو پر رکھ لیا۔ اور اس کی نازک انگلیوں میں کانٹا تلاش کرنے لگا ــــــ کرتے نے اپنی سازش کامیاب ہوتے دیکھی تو وہ چپکے سے کھسک گیا۔ اور سیدھا رآبیا کے پاس پہنچا۔ اور نازنین و فتح کی محبت کا مصنوعی قصّہ اسے سنایا۔ جب اس نے کرتے کی زبانی یہ کہانی سنی تو اسے ڈانٹا۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم جھوٹے ہو" ــــــ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ رآبیا ذرا بام پر جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو" ــــــ اور جب نازنین نے بالائے بام جا کر نظارہ کیا تو کرتے کی بات کو سچا پایا ــــــ اس نے نازنین کے سر کو فتح خان کے زانو پر رکھا۔ تو اس کے دل پر آرے سے چلنے لگے ــــــ اس کے دل میں فتح خان کے لئے محبت کی جگہ نفرت آنے لگی۔ اور جب فتح خان اسے ملنے آیا۔ تو اس نے صاف جواب دے دیا۔ ــــــ فتح خان حیران تھا۔ کہ آخر معاملہ کیا ہے ــــــ کرتے بھلا ایسا موقعہ کب ہاتھ سے دینے والا تھا۔ اس نے فتح خان کو رآبیا کے متعلق مزید بھڑکایا۔ بد دماغ ہو گئی ہے بھائی! یہاں تمہاری بے جا خوشامد اور حد سے بڑھے ہوئے پیار نے اسے مغرور بنا دیا ہے۔ وہ تمہیں خاطر میں نہیں لاتی۔ کیا سمجھ رکھا ہے اس نے اپنے آپ کو" ــــــ اگرچہ کرتے

کی اس بدگوئی سُنے فتح خان کے دل میں رابیا کی طرف سے بدگمانی پیدا کر دی تھی۔ تاہم اس کے لئے مابیا کو بھلا دینا انتہائی مُشکل تھا — وہ اس کے جسد میں بمنزلہ روح کے تھی۔ کرتے کی شرارتیں بدستور رنگ لا رہی تھیں۔ اس نے بادشاہ کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ فتح خان نے رابیا سے اپنا رشتۂ الفت توڑ دیا ہے اور اب وہ نازنین پر دل و جان سے فریفتہ ہے — شاہی نقارے نے فتح خان اور نازنین کی شادی کا اعلان کر دیا — اب کرتے کے لئے بظاہر رستہ صاف ہو چکا تھا۔ وہ وزیر سے ملا اور اس کو نازنین و فتح خان کے نئے رومان کا من گھڑت افسانہ سنایا۔ وزیر شاہ نے فتح خان کی اس حرکت کو اپنی توہین خیال کیا — اب درمقصود کرتے کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے فتح خان کی والدہ کو وزیر شاہ کے پاس بھیجا۔ اور اس نے رابیا اور کرتے کی شادی منظور کر لی۔

فتح خان نے جب حالات کو اس سرعت کے ساتھ بدلتے دیکھا تو وہ بددل ہو گیا۔ اس نے نازنین اور شادی کو ٹھکرا دیا۔ اس نے صاف کہدیا کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتا۔ نازنین اور فتح خان کی شادی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی — اور جب کرتے نے یہ مشہور کر دیا۔ کہ وہ بہت جلد رابیا کو اپنے گھر لانے والا ہے۔ تو رابیا پر ان دونوں خبروں کا بُرا اثر ہوا — اب وہ ہر وقت اوندھے منہ لیٹے اشکوں کا سیلاب بہاتی۔ یا پھر دھیمی دھیمی آنچ کے ساز پر دل کی فریاد کو پتوں کی زبان دیتی۔ آنسوؤں کے ہار پروتی اور پھر ان ننھے ننھے آبگینوں کو مٹی میں ملا دیتی — ایک طرف رابیا اور دوسری طرف فتح خان۔ ہجر و فراق کی بھٹی میں جل رہے تھے۔ انہیں اب بھی اپنے عشق صادق پر یقین تھا۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کے تصور سے معمور تھے۔ ان میں کسی دوسرے کے خیال کا گذر بھی ناممکن تھا — اور آخر ایک شام

رابیا نے اپنی کنیز کی زبانی فتح خان کو پیغام بھیجا ــــــ "تمہاری غیرت کیوں مر گئی۔ تم نے تمام عمر نباہنے کا وعدہ کیا تھا ــــــ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری رابیا کے پیزدان کو کوئی دوسرا ہاتھ لگے۔ یاد رکھو اگر تمہاری غیرت دم توڑ چکی ہے تو مجھ میں ابھی قوت باقی ہے۔ اگر کوئی دوسرا ہاتھ اس سونے کے پیزدان کی طرف بڑھا تو تمہاری رابیا اس پیزوان کو اپنے حلق میں اتار لیگی۔ مرنا ایک ہی دفعہ ہوتا ہے پیارے۔ عزت کی موت ہی میں ایک پٹھان عورت کی زندگی ہے۔"

فتح خان کا دل گواہی دے رہا تھا۔ کہ رابیا ایسی نہیں جیسا کہا جاتا ہے۔ اس پیغام نے اس میں نئی زندگی پھونک دی اور کنیز سے کہا "رابیا سے کہدو کہ صبح جب مرغ اذان دے اس وقت مجھے اپنے محل کے پچھلے دروازے پر ملے" ــــــ اور جب فتح خان اپنے وعدے کے مطابق علی الصباح پہنچا تو اس نے رابیا کو بہشتی لباس میں لپٹا ہوا ایک حور کی مانند پایا۔ فتح خان اور اس کے دوستوں کا ایک مسلح دستہ رابیا کو لے کر چلا گیا۔ کمرنے ہاتھ ملتا ہوا رہ گیا۔ اب اس نے بادشاہ کو جا کر مشتعل کرنا شروع کیا ــــــ لیکن شاہ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے فراق میں برا حال تھا۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ فوراً شاہزادے کو منا کر واپس لایا جائے ــــــ ان سپاہیوں کے ساتھ کمر بھی تھا۔

شاہی فوج نے ملک کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن شاہزادے کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر تین دن اور رات کی انتھک کوششوں کے بعد انہوں نے ایک مقام پر شاہزادے اور اس کی فوج کو خیمہ زن پایا ــــــ

فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سن کر یہ خیال کیا۔ کہ شاید یہ فوج ہمیں گرفتار کرنے آئی ہے۔ انہوں نے لشکر پر ہلہ بول دیا۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ یہ تو ہمیں منانے آئے ہیں۔ لڑائی رک گئی۔ آخر طے پایا۔ کہ رات

یہیں بسر کر کے صبح وطن واپس جایا جائے۔

کرتمے کے شریر ذہن نے سوچا کہ اگر شاہزادہ وطن واپس پہنچ گیا۔ تو میرے اعمال کی سزا مجھے ضرور ملے گی ـــــ کوئی ایسی چال چلنی چاہیئے کہ شاہزادہ واپس نہ جائے۔ اس نے رات کی تاریکی میں لشکر کے تمام گھوڑوں کو گاؤں کے کھیتوں کی طرف ہانک دیا۔ اور خود تلوار لے کر چپکے سے گاؤں میں گھس کر دو ایک پہرہ داروں کو قتل کر دیا ـــــ اس ہنگامے سے گاؤں میں ایک ہلڑ مچ گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں اسلحہ بند لوگوں نے کرتمے کا تعاقب کیا ـــــ کرتمے تو ایک خیمہ کے پیچھے چھپ گیا۔ لیکن گاؤں کے طوفانی لشکر نے فتح خان کے سپاہیوں پر جو سوئے پڑے تھے ایک دم حملہ کر دیا۔ خوابیدہ سپاہیوں کی بہت بڑی تعداد قتل ہو گئی ـــــ جو باقی تھے اُنہوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن کب تک ـــــ بدکردار کرتمے نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اس نے محو خواب رابیا کے ہاتھ پاؤں باندھے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اسے اٹھا کر بھاگنے ہی والا تھا۔ کہ فتح خان کو خبر ہو گئی۔ اس نے اس کا تعاقب کیا اور تلوار کے ایک ہی وار میں قتل کر دیا ـــــ

فتح خان کے ساتھی ایک ایک کر کے قتل ہو رہے تھے اب وہ یکہ و تنہا مصروفِ جنگ تھا۔ اور جب اسے اپنی زندگی خطرے میں نظر آئی۔ تو اس نے حسرت و یاس بھری نگاہوں سے رابیا کی طرف دیکھا ـــــ "فتح خان میں تمہارے بعد زندہ نہیں رہ سکتی، مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کرتے جاؤ" ـــــ فتح خان خون آلود تلوار ہاتھ میں لے کر آگے بڑھا۔ رابیا کے طلائی پیشر دامن کو ہٹا کر اس کے یاقوتی لبوں پر ایک طویل الوداعی بوسہ دیا، اس کی آنکھوں کا پیار لیا۔

"مجھے نہ تو کوئی دوسرا پیشر وان چاہیئے اور نہ ہی کسی کا بوسہ چاہیے وہ جنت

کی حور ہی کیوں نہ ہو رآبیا — میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دونگا. تمہارے ساتھ ہی اس خون میں نہاؤنگا" — ان الفاظ کے ساتھ فتح خان کی تلوار پانی کی طرح رآبیا کے حلق سے اُتر گئی۔ اور پھر یہ عاشق صادق دشمنوں کے ساتھ لڑتا ہوا رآبیا سے جا ملا۔

شاہ اسلم خان نے جب یہ خبر سنی تو اس کا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں تلے اندھیرے کے سیاہ سیاہ بھیانک دھبے ناچنے لگے۔ وُہ تخت سے منہ کے بل گرا۔ اور جب مصاحبوں نے اٹھایا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی ؎

جلات محبوبہ

رباب کی دھنوں سے حجرے کی دھواں دھار فضا میں ہماہمی کا تسلط تھا۔ ہر شخص دم بخود جھوم رہا تھا۔ جلات محبوبہ کا قصّہ ـــــ ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے رباب کے تاروں میں جلات اور محبوبہ چھپے بیٹھے ہیں۔ اور باری باری اپنا رومان دہرا رہے ہیں۔ ایک دم جمال ربابی نے زخمے کے آخری جھٹکے سے قصّے کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ اور سارے حجرے میں جیسے بھیانک سناٹا چھا گیا۔

'غونڈیا ـــــ چلم ـــــ؟' اطلس خان نے جیسے گہری نیند سے چونک کر کہا۔ اور دوسرے لمحے الاؤ کے دھوئیں میں چلم کا دھواں بھی شامل ہو کر فضا کو مزید کثیف بنانے لگا۔

'آج بابڑ کاکا نہیں آیا۔' مراد نے سرسوں کے تیل کے دیئے کی بتی درست کرتے ہوئے کہا۔

'آنے ہی والا ہوگا'۔ وہ آجکل عشاء کی نماز کے بعد ذرا وظیفہ بھی کرتا ہے'، کرتمے نے جواب دیا۔

'آنے دو اسے آج تو اس سے قصّہ سن کر ہی رہینگے۔ یہ بڈھا ہر روز ٹال جاتا ہے'، مراد نے کہا ـــــ اور اتنے میں بابڑ کاکا۔ کھانستا اور تسبیح کے دانوں پر انگلیاں پھیرتا حجرے میں داخل ہوا۔

"بابڑ کاکا، دروازہ بند کر دو، مراد نے کہا اور پھر تحیر راغے (خوش آمدی!
مترڑے مشئے (ماندہ نہ باشی) کی بے شمار آوازوں نے بابڑ کاکا کا استقبال کیا ——
.... —— مراد نے فیصلہ کن انداز کے
ساتھ بابڑ کاکا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم آج جلالت محبوبہ کا قصّہ سن کر رہیں گے"۔
"تجویزات بہت جا چکی ہے۔ پھر کبھی سہی"۔ بابڑ کاکا نے بڑی لجاجت کے ساتھ
کہا۔ لیکن "نہیں نہیں" کی صداؤں میں اس کی آواز کھو کر رہ گئی۔
غونڈے نے کہا۔ "بابڑ کاکا، چاہے دن چڑھ آئے۔ قصّہ آج ضرور سُنیں گے"۔
"اچھا بھئی تو سنو، بابڑ کاکا ہار چکا تھا۔ یاد رہے اگر کسی کی آنکھ بھی جھپکی۔ تو میں کہانی
بند کر دوں گا"۔ اپنی تسبیح کھدر کے لمبے کرتے کی بغلی جیب میں ڈالتے ہوئے بابڑ کاکا نے
گلا صاف کیا اور کہنے لگا:۔

ایک تھا بادشاہ، جس کا نام ناتمسلم تھا۔ اس کی ایک بیٹی تھی چندے آفتاب چندے
ماہتاب۔ اس کا نام محبوبہ تھا۔ کہتے ہیں یہ بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ اس کی کئی بیویاں تھیں۔
لیکن اولادِ نرینہ سے محروم تھا۔ لڑکیوں سے اسے نفرت تھی۔ وہ بیٹی ہونے کی خبر سُن کر
آگ بگولا ہو جاتا۔ کئی لڑکیوں کا پیدا ہوتے ہی اس نے اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ ڈالا —— محبوبہ
پیدا ہوئی۔ تو اس کی صورت اتنی من موہنی تھی کہ بادشاہ کی تمام بیویوں نے اسے بادشاہ کے
ظالم پنگل سے بچانے کا تہیّہ کر لیا۔ انہوں نے بڑی حکمت سے بادشاہ کو اس کی موت کا یقین
دلا کر محبوبہ کو ایک تہ خانے میں ڈال دیا۔ جہاں وہ دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل پلتی رہی۔
—— مشہور ہے کہ بکائن کے درخت اور لڑکی کے بڑے ہونے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔
محبوبہ دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو گئی۔ بادشاہ سیر و شکار کو جاتا تو وہ تہ خانے سے نکل کر

محل میں آجاتی اور بادشاہ کے آتے ہی پھر اسے تہہ خانے کی مختصر دنیا میں پہنچا دیا جاتا۔

کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ایک دن محبوبہ محل میں بیٹھی ہنس کھیل رہی تھی۔ کہ اچانک بادشاہ بغیر کسی اطلاع کے آوارد ہوا، ملکہ نے بدحواسی کے عالم میں محبوبہ کو جلدی سے ایک کوٹھڑی میں چھپا دیا۔ بادشاہ کو شبہ ہوا۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور محبوبہ کو دیکھکر ہکا بکا رہ گیا—— ملکہ نے مجبوراً ساری حقیقت بادشاہ کے سامنے بیان کر دی —— وہ اپنی بیویوں کی اس رازداری پر بڑا خفا ہوا۔ اور حکم دے دیا کہ محبوبہ کو قتل کر دیا جائے۔

رات کے سناٹے میں جب بادشاہ اپنے بستر پر لیٹا تو اس کے سامنے محبوبہ آکھڑی ہوئی محبت پدری نے جوش مارا۔ اور وہ اٹھ کر محبوبہ کو پیار کرنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے محبوبہ فضا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ وہ تو اس کا خیالی مجسمہ تھا۔ بادشاہ نے فوراً محبوبہ کا قتل رکوا دیا —— اور اس کی جان بخشی کر دی، لیکن ساتھ ہی اپنے محل کے ایک حصے میں زمین دوز بھول بھلیاں بنوا کر محبوبہ کو اس میں ڈال دینے کا حکم دیدیا دنیا کی ہر نعمت اس تہ خانے میں محبوبہ کے لئے موجود تھی—— بادشاہ نے اپنی بیگمات سے کہدیا تھا۔ کہ اگر کسی نے بھی محبوبہ کی شادی کا نام لیا تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی ——

بادشاہ کے حکم کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ بھول بھلیاں اتنی پیچ در پیچ تھیں۔ کہ کسی شخص کے لئے بھی اس کے راستے کو پانا ممکن نہ تھا—— محبوبہ کو خود بادشاہ بھول بھلیاں میں لے گیا۔ اس کے سر کو بوسہ دے کر اس سے رخصت ہوا"——

بڑے کاریگر تھے بھول بھلیاں بنانے والے بابڑ کا کا —— ؟ غونڈے نے پوچھا——

بڑے اُستاد تھے اپنے کام میں لیکن جانتے ہو ان بچاروں کو کیا صلہ دیا گیا ____؟ سب کو قتل کر دیا گیا تاکہ وہ کسی کو اس طلسمات کا راز نہ بتا دیں،

'پھر کیا ہوا، بابڑ کاکا' ____؟ سب نے یک زبان ہو کر پوچھا" ہونا کیا تھا وہی ہوا جو خدا کو منظور تھا۔ ایک دن چوری چھپے محبوبہ بھول بھلیوں کے طلسمات سے نکل کر محل کے بام پر کھڑی سیر تماشے میں مصروف تھی۔ کہ ایک راہ چلتے فقیر کی نظر اس پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا ____ محبوبہ تو تھوڑی دیر کے بعد واپس چلی گئی۔ لیکن فقیر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ایسے میں بادشاہ کی سواری اس طرف سے گذری۔ فقیر کی اس گستاخ حرکت نے بادشاہ کو برافروختہ کر دیا۔ فقیر گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے تو اس کی خوب پٹائی ہوئی، پھر اس کے قتل کا حکم دے دیا گیا۔

فقیر جس کا نام ملا میر تھا۔ کسی نہ کسی طرح جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اور راتوں رات شہر چھوڑ کر دوسرے ملک چلا گیا۔ یہ ملک محبوب نگر کے پڑوس ہی میں تھا۔ اس کے بادشاہ کا نام خونکار تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ جوان اور خوبصورت ____ ملا میر کے حواس درست ہوئے تو محبوبہ کے حسن و جمال کے افسانے ہر کس و ناکس سے بیان کرنے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ بات سارے ملک میں پھیل گئی۔ تم تو جانتے ہو کہ مشک ہرن کی ناف میں بھی نہیں چھپ سکتا۔

خونکار بادشاہ کے بڑے بیٹے نے جب محبوبہ شہزادی کے بے پناہ حسن کا شہرہ سنا۔ تو وہ غائبانہ عاشق ہو گیا۔ اور اسے حاصل کرنے کے لیے چل پڑا۔ جب وہ محبوبہ کے شہر میں پہنچا۔ تو وہاں دور دراز ملکوں سے کئی شہزادوں نے محبوبہ کے جمال دلفریب کا شہرہ سن کر قسمت آزمائی کے لیے ڈیرے ڈالے تھے،

بادشاہ یہ صورت حال دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ معاملہ نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ محبوبہ کے طالب پڑوسی ملکوں کے شہزادے تھے۔ اس لئے انہیں صاف جواب دینا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اور کسی کی دامادی قبول کرنا بھی اسے گوارا نہ تھی۔ کافی ہلیت سوچ بچار کے بعد اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس نے ایک ترکیب سوچی۔۔۔۔ باغ میں ایک نقارہ رکھوا کر اعلان کر دیا۔ کہ شہزادی کا ہر خواہش مند نقارہ بجائے۔ اسے بھول بھلیوں میں لایا جائے گا۔ جہاں شہزادی مقیم ہے۔ وہاں جس نے اسے پالیا اسی سے شہزادی کی شادی کر دی جائے گی۔ اور جو ناکام رہا اسے قتل کر دیا جائے گا۔

بادشاہ کا حکم سنتے ہی نقارے پر دھما دھم چوٹیں پڑنے لگیں۔ محبوبہ کے پروانے آتش عشق میں جلنے کے لئے سر سے کفن باندھنے لگے۔ بھول بھلیوں کے طلسم کو عبور کرنا ناممکن تھا۔ ہفتے عشرے میں بیسیوں امیدوار عروس شمشیر سے ہم کنار ہو کر موت کی نیند سو گئے۔ جو باقی بچے انہوں نے زندہ رہنا پسند کیا۔ اور اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئے۔

۔۔۔عشق و محبت کی منزل بڑی کٹھن ہے بچو! سمجھے ذرا بچ کے رہنا اس بلا سے! بابڑ کا کانے کھانستے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ "مقتول شہزادوں میں خونکار بادشاہ کا بڑا بیٹا بھی تھا۔ جب اس کے قتل کی خبر خونکار کی مملکت میں پہنچی تو اس کا دوسرا بیٹا قسمت آزمانے چل پڑا لیکن محبوبہ کا وصال اس کی قسمت میں بھی نہ تھا۔ اسی طرح خونکار کے چھ بیٹے یکے بعد دیگرے محبوبہ کے حسن کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔ ساتواں اور سب سے چھوٹا بیٹا بھائیوں کی موت کو برداشت نہ کر سکا۔ جوش انتقام سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اور رخت سفر باندھ کر محبوبہ نگر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ خونکار کو اس سے بڑی محبت تھی۔ جلالت، بادشاہ کے تمام بیٹوں میں خوبصورت۔ ذہین اور عقلمند تھا۔ باپ نے اسے

جانے سے منع کیا۔ بہتیرا روکا۔ لیکن اس نے کہا ابا ۔" یا تو میں محبوبہ کو حاصل کرونگا۔ یا پھر اپنے چھ بھائیوں کے خون کا بدلہ لونگا۔ مجھے میرے بھائیوں کی طرح سادہ لوح نہ سمجھو" یہ کہہ کر وہ سفید براق گھوڑے پر اسلحہ سے لیس ہو کر محبوبہ کے دیس کی طرف چل پڑا۔

ملا میر فقیر کو خونکار کے چھ بیٹوں کے مارے جانے اور جلالت کی روانگی کا سب حال معلوم ہو چکا تھا۔ اس نے شہر کے دروازے سے جلالت کو گذرتے دیکھ کر ٹھہرالیا ــــ اور کہا۔" شہزادے مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے بڑے کام آؤنگا۔" شہزادے کو ایک ہمدرد کی ضرورت تو تھی ہی۔ چنانچہ اس نے ملا میر کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ جب یہ دونوں محبوبہ کے دیس پہنچے تو ملا میر نے جلالت کو نقارہ بجانے سے روکا۔ اور اسے فقیروں کے کپڑے پہنا دیئے۔ تاکہ کوئی پہچان نہ لے اور پھر دونوں بھول بھلیوں کے طلسم کا سراغ لگانے گلی گلی کوچے کوچے گشت کرنے لگے۔" بھئی عشق کیا کچھ نہیں کراتا۔ قیس بھی شہزادہ تھا۔ لیکن اس محبت کے ہاتھوں بچارا مجنوں ہو کر رہ گیا ــــ" ہاں تقدیر کے کرشمے دیکھو کہ ایک دن محبوبہ کی ایک چھیل چھبیلی کنیز عطر خریدنے بازار آئی۔ اس کی نظر جلالت پر پڑی۔ گدڑی میں لال دیکھکر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اور جب واپس حرم سرا گئی تو اس انوکھے فقیر کے حسن و جمال کی داستان کچھ اس انداز سے بیان کی۔ کہ شہزادی کا دل بے قرار ہو گیا۔ اور اُسے ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپنے لگی۔ اس مشکل کو کنیز نے حل کیا۔ اس نے ترکیب بتائی کہ شاہی محل کے دروازے پر بہت بڑی خیرات کی جائے اور شہر کے تمام فقیروں کو بلایا جائے۔

شاہی حرم سرا کے باہر فقیروں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ خیرات بٹ رہی تھی۔

شہزادی ایک جھروکے سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی اور اس کی نگاہیں اپنے در مقصود کی تلاش کر رہی تھیں۔ کنیز نے بائیں طرف ستون کے ساتھ ٹیک لگائے ایک گدڑی پوش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ فقیر ہے شہزادی صاحبہ" جونہی شہزادی کی نظریں چار ہوئیں تن بدن کی خبر نہ رہی۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ کنیز نے لخلخہ سونگھایا۔ جب شہزادی کو ہوش آیا تو اس کا دل گھائل ہو چکا تھا۔ اس نے کنیز سے کہا: "یہ روگ تم نے ہی لگایا اب خدا کے لئے اس کا علاج بھی ڈھونڈو۔ آج شہزادی کے لہجے میں التجا تھی تحکم نہیں تھا" ـــــ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ عشق ارسطو سے بھی عقل چھین لیتا ہے ـــــ کنیز بچاری کیا کرتی۔ لیکن جب خدا کسی پر مہربان ہوتا ہے۔ تو سمندر اسے راستہ دے دیتے ہیں۔ اور پہاڑ اس کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں۔

ملا تیر کو کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ شہر میں ایک بہت بڑا سنار مہندی نامی ہے۔ جس کی ماں ہر روز محبوبہ کے لئے سونے کی تاروں والا پھولوں کا تازہ سہرا گوندھ کے لے جاتی ہے۔ اور مہندی شہزادی کے لئے زیور بناتا ہے ـــــ یہ سنتے ہی ملا تیر نے دل میں کہا۔ بس کام بن گیا۔ وہ دوسرے دن جلالت کو مہندی سنار کے پاس لے گیا۔ اور اس کی منت زاری کر کے اسے راضی کر لیا۔ کہ اس کے لڑکے کو شاگرد بنا لے اور زرگری سکھائے۔ سنار اور جلالت ہم عمر تھے وہ جلدی ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کی محبت اتنی بڑھ گئی۔ کہ مہندی نے اسے اپنا بھائی بنا لیا۔

جلالت کی خوبصورتی بھی شہر میں ضرب المثل بن گئی۔ سارے شہر کی عورتوں اور لڑکیوں کا مہندی کی دکان پر جمگھٹا لگا رہتا۔ دکان بند کر کے گھر پہنچتے تو وہاں بھی

یہی عالم ـــــ وُہ شہزادے کو ایک نظر دیکھنے کے لئے اپنے ہار، کڑے اور جھومر توڑ کر مرمت کے بہانے آجاتیں۔ مہندی کے دن پھرتے گئے۔ وُہ پہلے سے کہیں زیادہ دولت مند ہو گیا۔ اور جلاّت کے ساتھ اس کا انس اور میل ملاپ بڑھ گیا۔ اب وہ خوشامد کی حد تک اس کی خاطر تواضع کرتا۔ "تم تو جانتے ہو۔ دولت کے آگے بڑے بڑے سر جھکا دیتے ہیں۔" ہاں تو۔ ایک دن مہندی کی ماں کسی کام کے لئے باہر گئی ہوئی تھی۔ واپس آئی تو جلات نے شہزادی محبوبہ کے لئے پھولوں کا سہرا تیار کر رکھا تھا۔ بڑھیا نے سہرا بہت پسند کیا۔ اس نے جلاّت کی ذہانت اور محنت کی داد دی۔ اور سہرا لے کر محبوبہ کی خدمت میں چلی گئی۔

شہزادی سہرا دیکھ کر حیران ہوئی اور پوچھا: "بڑھیا یہ تو تمہارے ہاتھ کا سہرا نہیں بتاؤ یہ کس نے بنایا ہے آج؟" بڑھیا نے گھبراہٹ میں کہہ دیا: "میری بیٹی سسرال سے یہاں آئی ہے۔ یہ اسی نے بنایا ہے۔" شہزادی نے کہا: "میں تمہاری اس ذہین بیٹی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کل ضرور اسے اپنے ساتھ لے کر آنا"۔ یہ سنتے ہی بڑھیا بچاری کے ہوش وحواس گم ہو گئے۔ اس کے بیٹی ہوتی تو کل ساتھ لے کر آتی۔ گھر آکر سارا قصّہ جلاّت کو سنایا۔ اور کہا "بیٹا اب کیا ہوگا؟" جلاّت نے بڑھیا کو تسلی دی۔ اور پھر ملاّ میر سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ملاّ میر بڑا خوش ہوا۔ اس نے شہزادے سے کہا: "اب سمجھو تمہاری قسمت کھل گئی۔" اور دوسرے دن جب ملاّ میر نے جلاّت کو لڑکیوں کی طرح بنایا سنوارا اور زنانہ کپڑے پہنائے۔ تو مہندی اور بڑھیا حیران ہو گئے۔ اس وقت جلات کی چھب ڈھب شہزادیوں سے کم نہ تھی۔ وہ بسم اللہ کر کے بڑھیا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

شہزادی نے بڑھیا کو رخصت کر دیا اور کہا کہ آج رات تمہاری لڑکی میرے پاس

رہے گی۔ کل آ کر اسے لے جانا۔ شہزادی کو بڑھیا کی "لڑکی" سے اتنی محبت ہو گئی۔ کہ وہ تمام رات نہ سوئی اور اس کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔ دنیا جہان کی باتیں۔ بعض دفعہ تو جلالت کی باتوں اور اس کی دو ایک حرکتوں سے کچھ شک بھی گذرا کہ یہ لڑکی تو نہیں ہوسکتی لیکن پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر خاموش ہو رہی۔ ایک دفعہ تو وہ لڑکی سے پوچھ بھی بیٹھی "لڑکی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے؟" اور جلالت نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا۔ "لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن کہاں ہم غریب اور کہاں آپ آپ کی صورت تو آج تک چاند ستاروں نے بھی نہیں دیکھی۔

رات بھر مہندی سنار کی ماں کو نیند نہ آئی۔ اس کا خون شیشے میں تھا۔ اسے یہی خیال تھا کہ جلالت قتل ہو چکا ہو گا۔ دوسرے دن حسب معمول وہ سہرا لے کر گئی۔ لیکن سہمی سہمی اس نے ڈرتے ڈرتے شہزادی کے کمرے میں قدم رکھا۔ اور جب جلالت کو زندہ اور شہزادی کو خوش دیکھا۔ تو جان میں جان آئی —— شہزادی نے بڑھیا کی لڑکی کی بڑی تعریف کی۔ اور انعام و اکرام دے کر رخصت کیا۔ اس ملاقات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ شہزادے کی بے قراری بڑھ گئی۔ کام کاج چھوڑ دیا۔ کھانا۔ پینا ترک کر دیا۔ ہر وقت اداس رہنے لگا۔ مہندی جلالت کی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اور آخر ایک دن شہزادے نے مہندی کو اپنی محبت کا سارا قصہ کہہ سنایا۔ اور کہا "اب میری زندگی تمہارے ہاتھ ہے۔ تم نے مجھے بھائی کہا ہے۔ اگر شہزادی مجھے نہ مل سکی تو میں نقارے پر چوٹ دے کر اپنی جان دیدونگا۔" مہندی نے جب یہ افسانہ سنا تو اسے یقین نہ آیا۔ کہ سچ مچ اس کے گھر شہزادہ ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے شہزادے کو تسلی دی —— اور سوچنے لگا۔ کہ اگر شہزادے کی مدد نہ

کی تو ناحق جان دے دیگا۔ اور دنیا مجھ پر لعنت کریگی۔ کہ بھائی کسی کام نہ آسکا۔ بہت دن سوچنے کے بعد ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔

ہمنڈی صرف زرگر ہی نہ تھا۔ بلکہ بڑا کاریگر بھی تھا۔ وُہ مصور بھی تھا۔ اور لکڑی سے قسما قسم کے بُت بھی بناتا تھا۔ اس نے آبنوس کی خوبصورت لکڑی سے ایک شیر بنلیا۔ بڑا دلکش جو بھی اسے دیکھتا سچ مچ کا شیر سمجھ کر ڈر جاتا۔ جب اس شیر کو چابی دی جاتی۔ تو وہ اصلی شیر کی طرح حرکت میں آتا۔ اور دھاڑنے لگتا۔ ہمنڈی نے شیر کے اندر جلات کو بٹھا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ سر دربار شیر کو چابی دی گئی۔ اس نے اصلی شیر کی طرح حرکت کی اور پھر دھاڑنے لگا۔ بادشاہ اور حاضرین بڑے محظوظ ہوئے اور ہمنڈی کی عقلمندی پر عش عش کر اُٹھے۔ چنانچہ اسے بہت سا انعام واکرام ملا۔

ہمنڈی کی کاریگری کی دھوم سارے شہر میں مچ گئی۔ یہ خبر رفتہ رفتہ نجوبہ شہزادی کو بھی پہنچی۔ اس نے اپنی خواہش کا اظہار بادشاہ سے کیا۔ بادشاہ نے ہمنڈی کو حکم دیا۔ کہ وُہ شیر کو حرم سرا میں بھیجدے تاکہ میری اکلوتی بیٹی اسے دیکھ سکے۔" غونڈے، او غونڈیا۔ کمبخت اونگھ رہا ہے ——؟ ہونہہ اُٹھ ذرا چلم تو پلا۔ باڑکاکا نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ اور غونڈے نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ اور ہتھیلیوں میں تمباکو ملنے لگا۔ باڑکاکا نے ایک دو لمبے لمبے کش لگائے۔ پھر کھانسنے لگا۔ جب گلا اور سینہ صاف کر چکا۔ تو کرتے کی جیب سے نسوار کی ڈبیہ نکالی۔ ایک بھرپور چٹکی لیکر اپنی داہنی باچھ میں بڑی احتیاط سے رکھی۔ اور پھر کہنے لگا۔ تو کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ہاں میں کیا کہہ رہا تھا کرتے ؟ یہی ناکہ شہزادی نے شیر کا تماشا دیکھنا چاہا۔ اللہ پاک تجھے ایمان نصیب کرے"، تو ہمنڈی نے جلات کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ برادرعزیز

اب تیار ہو جاؤ۔ بڑی ہوشیاری سے کام کرنا۔ محبوبہ کے دربار میں پہنچانا میرا کام ہے۔ آگے تم جانو۔ بیٹھ جاؤ اس شیر میں اور جلالت کو شیر میں بٹھا کر محبوبہ کی کنیزوں کے حوالے کر دیا۔

شیر محبوبہ کی محفل میں رات گئے تک طرح طرح کے کرتب دکھاتا رہا۔ دھاڑتا ڈکارتا رہا۔ آخر سب تھک ہار کر سو گئے۔ تو جلالت چپکے سے باہر آیا۔ اور شہزادی کی انگوٹھی اور دوشالہ لے کر پھر شیر میں جا چھپا۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جب محبوبہ کی آنکھ کھلی۔ تو دوشالہ اور انگوٹھی نہ پا کر سخت حیران ہوئی۔ ادھر ادھر تلاش کی۔ بڑا سوچتی رہی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اور اسی سوچ میں وہ نیم باز آنکھیں کئے پڑی تھی۔ کہ اس نے دیکھا کہ شیر کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اس میں سے ایک آدمی نکل کر پنجوں کے بل چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ تو وہی فقیر ہے۔ جس کی تعریف کنیز نے کی تھی۔ اور جو حرم سرا کے دروازے پر خیرات لینے آیا تھا۔ اور بڑھیا کی بیٹی کے روپ میں بھی وہی تھا۔ لیکن وہ چپکے پڑی رہی۔ جلالت آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چلتا ہوا شہزادی کے سرہانے آ بیٹھا اور بڑی حسرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ پھر یکا یک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے پیزدان کے نیچے دبے ہوئے سرسن کے دو پتوں کو چومنا چاہا۔ کہ محبوبہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا "چور۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم کون ہو۔۔۔۔ ؟ یہاں کس لئے آئے ہو۔ اور یہ سب کچھ کیا ہے" جلالت نے محبوبہ سے اپنی محبت۔ اور اس کے باپ کے ظلم کی داستان بیان کی۔ محبوبہ کو پہلی دفعہ اس کا علم ہوا۔ کہ اس کا باپ اس کے نام پر کتنے بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ چکا ہے۔ اسے اپنے باپ سے نفرت ہو گئی۔ اور پھر شہزادی نے بھی

اپنے دِل کی بات جلات کو بتائی۔ "جلات دِل چیر کر نہیں بتایا جاسکتا۔ ورنہ میں تجھے بتاتی کہ اس کے ہر گوشے میں تمہاری محبت رچی ہوئی ہے۔ جب جلات رخصت ہونے لگا۔ تو محبوبہ نے کہا کہ "کل تم نقارے پر چوٹ لگانا۔ اور نڈر بھول بھلیوں میں چلے آنا۔ میں تمہیں پہلے ہی موڑ پر ملونگی۔

دوسرے دن مہندی کو اس کا شیر واپس دے دیا گیا۔ مہندی اور ملا عنبر کو جلات نے تمام روداد کہہ سنائی۔ اور خوشی خوشی شاہی باغ میں جا کر نقارے پر چوٹ لگائی۔ بادشاہ کے پیشکاروں نے اسے پھولوں کے ہار پہنا کر بھول بھلیوں میں بھیجدیا۔ جلات نے جونہی بھول بھلیوں میں قدم رکھا۔ فتح و کامرانی نے اس کے قدم چومے ـــــ اور پہلے موڑ پر ہی سرو قد محبوبہ نے اسے خوش آمدید کہی۔ دونوں نے گلے مل کر ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دِل کی کہانی سنی، اور پھر بڑی دیر تک آپس میں راز و نیاز ہوتے رہے۔

جلات جب اپنے دلِ مقصود کو لے کر بھول بھلیوں کے گورکھ دھندے سے باہر آیا۔ تو مہندی گھوڑا لئے کھڑا تھا۔ دونوں گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اب قاعدے کے مطابق جلات کو بادشاہ کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس نے اس کے برعکس گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ بادشاہ کو جب خبر ہوئی۔ کہ جلات، محبوبہ کو لے کر فرار ہو گیا ہے۔ تو آگ بگولا ہو گیا۔ اور جلات کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھی، ـــــ لیکن بادشاہ کی فوجیں جلات کی گرد کو بھی نہ پا سکیں۔ جلات نے اپنے شہر پہنچکر محبوبہ کو حرم سرا میں پہنچایا۔ جلات کے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر طرف خوشیاں ناچنے لگیں۔ بادشاہ بھی خوش تھا کہ اس کے تخت و تاج کا وارث بخیریت واپس آگیا ـــــ لیکن جلات

نے بادشاہ سے کہا کہ "ابا حضور فوجیوں کو جلدی تیاری کا حکم دے دیجئے۔ تھوڑی دیر میں نامسلم بادشاہ ہمارے ملک پر حملہ کر دے گا ——— ایک دم طبل جنگ بجایا گیا۔ خونکار بادشاہ کا لشکر جرار میدان میں اُتر آیا۔ اور دونوں فوجیں آپس میں گتھ گئیں۔ گھمسان کا رن پڑا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ انسانوں کے خون سے جل تھل بھر گئے۔ نامسلم بادشاہ کی بے شمار فوج تلوار کے گھاٹ اتر گئی۔ جو باقی بچی وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلی۔ بادشاہ زخمی ہو گیا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ محبوبہ سے اپنے باپ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اور اس نے اسکی جان بخشی کرا کے بڑی عزت کے ساتھ اپنے ملک واپس کر دیا۔

شہزادی محبوبہ اور شہزادہ جلالت پھول اور بھنورے کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرتے تھے۔ بادشاہ نے بڑی دھوم دھام کے ساتھ اس چاند اور چکوری کی شادی کر دی۔ جلالت محبوبہ کی کہانی ختم ہوئی۔ دعا کرو جس طرح ان دونوں کی مرادیں حاصل ہوئیں۔ خدا ہم سب کی مرادیں بھی پوری کرے"۔

خادی، بیبو

جوانیوں کے دم خم کا مقابلہ جوانیاں ہی کر سکتی ہیں —— جوانی چاہے مخمل کے چھپر کھٹ پر ہو یا سبزۂ بیگانہ کے فرش پر اس کی تمکنت، اس کی آن اور اس کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جوانی کی پرکاری قیامت سہی لیکن اس کی سادگی پر بھی مر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔

خادی اور بیبو جب پہاڑ پر لکڑیاں کاٹنے جاتے اور بیبو کے گورے گورے مکھڑے پر پسینے کے قطرے ڈھلکتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے یاقوتی انار سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں —— حسن محنت سے نکھر جاتا۔ خادی کی چلتی ہوئی کلہاڑی درخت کی کسی شاخ پر رک جاتی۔ اور وہ بیبو کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ بیبو کو اس کا احساس ہوتا تو وہ انگلی سے اشارہ کر کے چلاتی "گیدڑ گیدڑ" اور خادی کا تصور مرکز کھو بیٹھتا۔ اس کی محویت کے حسین تانے بانے اُلجھ کر رہ جاتے۔

کہتے ہیں قندھار کے ایک گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے —— ولی محمد اور علی محمد —— دونوں کھاتے پیتے گھرانے کے افراد اور اپنی اپنی کندی کے ملک تھے۔ خادی خان ولی محمد کا لڑکا اور بیبو علی محمد کی لڑکی تھی۔

کسے خبر تھی کہ بچپن کے یہ دو پھول جو دھول میں اَٹے ہوئے کھیل رہے ہیں اور مٹی کے گھروندے بنا بنا کر بگاڑ رہے ہیں۔ ایک دن لیلیٰ مجنوں کی سی شہرت حاصل کر لیں گے

اور آج گھروندوں کو بنا بنا کر بگاڑنے والے مستقبل میں اپنی ہستیاں انہی گھروندوں کی طرح مٹا دینگے۔ عشق ان کا رہبر ہوگا، پریم نگر ان کی منزل اور موت ان کا انجام ہے

موت ان کے وصل کا پیغام ہے
آہ کتنا دلفزا انجام ہے

بچپن کی محبت جوان ہو کر عشق بن گئی، اسی پینگ کی لہروں میں وہ کھو گئے۔ عشق و محبت کی بھی پینگ ان کے لئے قوس قزح بھی تھی اور کہکشاں بھی ——

ایک دن جب یہ دونوں محبت کے پروانے لکڑیاں کاٹ کر ایک درخت کے سائے میں سستانے بیٹھے تو بیبو کی آنکھ لگ گئی۔ خوشگوار ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں نے اسکی سیاہ زلفوں کو گلاب کے پھول ایسے سرخ و سفید چہرے پر بکھیر دیا۔ اس عالم میں وہ ایک ارضی حور نظر آنے لگی۔ خادی اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ اور اس نے بے قابو ہو کر اپنی محبت کا پہلا بوسہ بیبو کے ہونٹوں پر ثبت کر دیا۔ خادی کی اس حرکت نے گویا سوئی ہوئی ناگن کو چھیڑ دیا۔ بیبو جھنجھلا کر اٹھی وہ غیظ و غضب سے کانپنے لگی اور خادی پر برس پڑی۔ بیبو کا یہ رویہ خادی کی توقعات کے خلاف تھا۔ عشق نے حسن سے معذرت چاہی۔ لیکن عشق حسن کو اتنا بے قابو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے حسن کے وقار کو صدمہ پہنچایا تھا۔ بیبو نے معذرت قبول نہ کی۔ اور وہ روٹھ کر چلی گئی۔

خادی نے بیبو کی اس بے اعتنائی کو بری طرح محسوس کیا اور اس نے شہر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ جب بیبو کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے خادی کا تعاقب کیا اور اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کرکے اسے روکنے کی بہتیری کوشش کی

لیکن وہ اسے روتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔

خادی کے جانے کے بعد بیبو کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کی ماں نے سبب دریافت کیا۔ پہلے تو اس نے ٹالنا چاہا لیکن آخر ماں کے اصرار پر سارا ماجرا بے کم و کاست کہہ سنایا۔

خادی اپنی محبوبہ کے تصور میں کھویا ہوا ایک نامعلوم منزل کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا کہ دل آرام گاؤں کے پاس اسے ایک قافلہ ملا۔ میر قافلہ نے ایک جوان رعنا کو یوں پاپیادہ یکہ و تنہا لق و دق صحرا میں گم سفر دیکھ کر قافلہ ٹھہرایا۔ اور خادی کو بلا کر ملازمت کی پیشکش کی۔ خادی اس کے لئے تیار نہ تھا۔ لیکن میر قافلہ کے ہمدردانہ رویہ نے اسے یہ نوکری کرنے پر مجبور کر دیا —— اور جب قافلے نے رخت سفر کھولا۔ تو اس نے اپنے آپ کو اصفہان کی اجنبی سرزمین پہ پایا۔

بیبو کی حالت دن بدن غیر ہوتی گئی۔ جب اس کے باپ نے اپنی اکلوتی بچی کو اس حال میں دیکھا۔ تو اس نے خادی خان کی تلاش شروع کی۔ لیکن بے سود۔ بیبو اس کے بغیر بے آب و دانہ پنچھی کی طرح پڑی زندگی کے دن گذار رہی تھی۔ وہ ہر روز دلآرام گاؤں کے چوراہے پر کھڑے ہو کر قافلوں کا انتظار کرتی۔ ہر آنے جانے والے سے خادی خان کے متعلق دریافت کرتی۔ اور ہر شام ناکام و نامراد واپس لوٹتی۔

اور پھر ایک دن اس اندھیارے میں امید کی ایک کرن پھوٹی۔ ایک قافلے والے نے خادی خان کا خط لاکر دیا —— خط دیکھتے ہی بیبو کے اجڑے باغ میں بہار آگئی۔ خادی خان نے اپنے باپ کو لکھا تھا ——

"میں اصفہان کا بہت بڑا سوداگر ہوں۔ بیبو کی یاد اب تک میری زندگی کا

سازوسامان ہے۔ لیکن وہ بڑی بے مہر ہے۔ اسی لئے میں اپنے وطن نہیں آنا چاہتا؟"
خادی خان کے خط نے بیبو میں نئی زندگی بھر دی ——— اس نے جواب لکھوایا۔ "پیارے خادی۔ میں تمہاری ہوں۔ میں نے تیرے بعد اپنے اور بل میں پھول نہیں سجائے کس کے لئے سجاؤں۔ تم جلدی آؤ۔ ورنہ مجھے زندہ نہیں پاؤ گے۔"

خادی خان کے باپ نے اصفہان جانے کی تیاری کی۔ بیبو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے خادی خان کے نام خط اپنے چچا کو دیا۔ چچا نے اسے تسلی دی "بیٹی میں خادی کو لے کر آؤنگا۔ ورنہ خود بھی نہ آؤنگا۔"

ایک مدت کے بعد اصفہان میں بچھڑے ہوئے باپ بیٹے ملے۔ گلوں شکووں کے دفتر کھلے۔ اور جب بیبو کا خط خادی نے پڑھا تو اس کی آنکھوں نے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی ———

ایک دن جب خادی اور اس کا باپ اپنی عالیشان حویلی میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ ولی محمد نے خادی کو وطن چلنے کے لئے مجبور کیا۔ لیکن خادی نے روتے ہوئے باپ سے کہا۔ "اباجان۔ میرا وطن کوئی نہیں۔ ایک بیبو تھی سو اس کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں۔ وہاں جا کر بھی اگر سلگنا ہے تو یہاں کیا برائی ہے۔ پروانہ شمع کے جتنا نزدیک ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ اسے تکلیف ہو گی۔"

"نہیں بیٹا تو غلط سمجھا ہے۔ بی بو تو ترے بغیر زندہ ہی نہیں رہنا چاہتی۔ اگر تم نہ گئے تو بیبو اور تمہارے چچا دونوں خودکشی کر لیں گے۔ میں بیبو کے ساتھ وعدہ کر آیا ہوں کہ خادی کو لے کر آؤنگا۔"

باپ کی ان باتوں نے جیسے خادی خان کو نئی زندگی عطا کر دی۔ وہ فرطِ شوق میں اسی وقت وطن جانے کے لئے تیار ہو گیا ——— جوں جوں دیارِ محبوب کے قریب پہنچتا آتشِ محبت تیز تر ہوتی جاتی۔ جب وہ فراہ کے مقام پر پہنچے تو اس نے اچانک اپنے آقا میر قافلہ تاج محمد خان کو دیکھا۔ جو ہندوستان سے واپس آ رہا تھا۔ اس نے خادی خاں سے کہا تم ہندوستان جا کر میرے بھائی سے میری ایک لاکھ کی سندیں جو میں وہاں بھول آیا ہوں۔ لے آؤ۔ اس کے بعد اپنے گاؤں چلے جانا۔ خادی خان سمندر پر پہنچ کر پیاسا واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں سے ہو کر ہندوستان جانا منظور کر لیا ——— خادی باپ سے پہلے ہی اپنے گاؤں آ پہنچا۔ اور اپنے چچا کے گھر پر دستک دی۔ بیبو کی ماں دروازے پر آئی لیکن اس نے خادی خان کو نہیں پہچانا اور پوچھا "تم کون ہو"

"میں ایک مسافر ہوں۔ مہمان ہوں۔ مزدوری کے لئے آیا ہوں۔ ذرا پانی کا ایک گھونٹ اور چلم کا ایک کش چاہیئے۔"

بیبو کی ماں کو شک گذرا۔ اس نے سوچا کہیں یہ خادی خان نہ ہو۔ لیکن اس نے بیبو سے کہا "بیٹی دروازے پر ایک مسافر آیا ہے پانی اور چلم مانگتا ہے۔ اس کی مدد کرو۔"

"جیسے بیبو کو کسی نے کان میں کہہ دیا ہو کہ مسافر نہیں خادی ہے۔ وہ ہرنی کی طرح دوڑتی ہوئی دروازے پر آئی۔ پانی دینے لگی۔ تو اس نے دروازے کی اوٹ سے ہی اسے پہچان لیا۔ وہ خوشی کے مارے واپس بھاگی۔ اور چلم کو تازہ کیا پھر اس میں تمباکو بھرا اور جب آگ رکھنے لگی تو خوشی کے عالم میں اپنی انگلیاں جلا بیٹھی۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔" یا اللہ کبھی پہلے تو یہ آگ خادی خان کے عشق کی آگ پر سبقت نہ لے گئی تھی۔ آج اس نے کیوں مجھے جلا دیا"——— خادی خان نے دروازے کی اوٹ سے جب بیبو کی انگلی جلتی دیکھی تو کہا "میری بیبو کتنی اچھی ہے۔ میرے لئے اپنی انگلیاں جلا بیٹھی ہے۔" اور جیسے اس فقرے نے جلی ہوئی انگلیوں پر مرہم کا فور رکھ دیا۔ اور اس نے چلم لاتے ہوئے کہا۔"میں چلم پر اپنے پیرزوان کا سایہ کر کے جاؤنگی۔ اور اس بہانے خادی کے ہونٹ میرا بوسہ لیں گے۔"

اور جب دونوں کا سامنا ہوا تو کسی نامعلوم کشش نے دونوں کے سینے اور لب پیوست کر دئیے ——— دونوں نے ایک دوسرے کو خوشی کے آنسوؤں کے ہار پہنائے۔"شام کی طرح چادر نے دونوں کو چھپا لیا۔ خادی بیبو سے رات کو ملنے کا وعدہ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

جب رات کو بیبو، خادی کے گھر جانے لگی، تو اسے باپ نے سمجھایا کہ چونکہ تمہاری شادی اس کے ساتھ ہونے والی ہے۔ اس لئے تمہارا اس کے گھر جانا مناسب نہیں لوگ باگ انگلیاں اٹھائیں گے ———

خادی نے محبوب کے انتظار میں ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی لیکن کوئی آہٹ بھی اسے بیبو کی آمد کا پیغام نہ دے سکی۔ اسی طرح تین راتیں اس نے بیبو کے انتظار میں گزار دیں ——— اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ تو اس نے رخت سفر باندھ لیا۔ اور پھر کبھی واپس نہ آنے کا عہد کر کے نکل کھڑا ہوا ——— باپ اور ماں نے بہت منت سماجت کی۔ لیکن اس نے ایک نہ مانی ——— آخر بیبو کو خبر کی گئی۔ کہ شاید عشق از خود رفتہ حسن کا کہا مان جائے ——— لیکن ایک دفعہ پھر عشق

کی خودی بیدار ہو چکی تھی۔ خادی نہ رکا۔ جب بیبو نے اسے اپنی مجبوریوں کی داستان آنسوؤں کے سیلاب میں کھڑی ہو کر سنائی۔ تو اس کا دل پسیجا۔ اس نے بیبو کو گلے لگایا۔ لیکن ترک سفر پر آمادہ نہ ہوا ــــــ تب بیبو نے کہا اگر جانا ہی ہے تو اپنے ہاتھ سے اس مٹی پر ایک نشانی بناتے جاؤ۔ تاکہ تمہارے بعد اس کھلونے سے جی بہلاتی رہوں خادی نے مٹی کی ایک ڈھیری بنا کر اس پر اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ لگا دیا۔ اور پھر اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

شب و روز کی طویل مسافت کے بعد خادی خان کوئٹہ پہنچا۔ جہاں میر قافلہ کا بھائی باز محمد رہتا تھا ــــــ باز محمد نے اسکی بڑی خاطر تواضع کی اور چند دن اپنے ہاں مہمان رہنے کو کہا۔ لیکن خادی خان بولا مجھے سندریں لے کر جلدی اصفہان پہنچنا ہے۔ باز محمد نے کہا یہ پٹھانوں کا دستور نہیں کہ ایک آدھ دنبہ ذبح کئے بغیر مہمان کو رخصت کر دیں۔ مجبوراً خادی خان کو وہاں ٹھہرنا پڑا۔

ایک دن خادی خان بیبو کے خیال میں مگن اکیلا بیٹھا تھا۔ کہ اتنے میں ایک لمبے بالوں والی حور وش لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ــــــ اور آتے ہی بڑی بے باکی سے کہنے لگی۔

"اے میرے باپ کے مہمان تو کہاں سے آیا ہے اور کون ہے؟"

"میں اصفہان سے آیا ہوں۔ تمہارے چچا نے مجھے ایک کام سے بھیجا ہے میرا نام خادی خان ہے ــــــ اے میری میزبان تمہارا نام ــــــ ؟

"میرا نام شیریں ہے ــــــ اے خوبصورت جوان۔ تجھ میں بڑی کشش ہے"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا"

"تم تو جیسے جادوگر ہو۔ تمہیں دیکھتے رہنے کو دل چاہتا ہے"

"تم تو میری بیٹیو کی طرح محبت آمیز باتیں کر رہی ہو۔"

"مرے اور بل کے پھول، دل تو تمہارا قیدی بن چکا ہے۔ اب میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہ سکوں گی۔"

"ایسی باتیں مناسب نہیں۔ میں کل چلا جاؤں گا۔ سنتی ہو میری بہن"

"خادی خان۔ ان باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ یا تو تمہیں یہاں رہنا پڑے گا۔ یا پھر مجھے بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا ہو گا۔"

"فضول باتیں نہ کرو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

"خادی خان اب تو میرا دل میرے قبضے میں نہیں رہا۔"

"دیکھو چلی جاؤ۔ کوئی آنہ جائے۔ شام کو قلعہ کی دیوار کے پاس ملیں گے۔"

اس بہانے خادی خان نے شیرینو سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اب اس نے کوشش کی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے رخصت ہو جائے۔ کیونکہ شیرینو کے پنجے سے نجات حاصل کرنے کا واحد حل یہی تھا۔ شام کے وقت باز محمد خان سے اس نے رخصت چاہی۔ مگر اس نے کہا کہ کل گاؤں جا کر سندیں لے آؤں گا تم پرسوں چلے جانا۔ اور جب خادی نے بھی اس کے ساتھ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اس نے کہا تمہارا جانا خلاف مصلحت ہے۔

دوسرے دن صبح باز محمد چلا گیا۔ تو خادی خان نے سوچا۔ کہ ابھی پھر وہ خوبصورت بلا آدھمکے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ کہیں باہر چلا جاؤں —— ابھی اس کی سوچ کا سلسلہ ختم بھی نہ ہوا تھا۔ کہ وہ خوبصورت بلا آدھمکی۔ آج اس نے خادی خان کے لئے بڑے پر تکلف کھانے پکائے تھے ——

"خادی خان تم کیسے پٹھان ہو۔ پٹھان تو بات کا پکا ہوتا ہے۔ قلعے کی دیوار کے سائے میں میں نے تمام رات تمہارے انتظار میں گزار دی"

"مجبور تھا شیرینو۔ تمہارا باپ میرے پاس تھا۔ آج ضرور آؤنگا"

"اچھا جادوگر پٹھان۔ کھانا کھالو۔ تاکہ پھر خوب پیار کریں"

"شیرینو! میں نے ابھی تک نہ تو وضو کیا ہے اور نہ ہی نماز پڑھی ہے۔ تم انتظار کرو۔ میں آتا ہوں"

خادی خان یہ کہہ کر مسجد چلا گیا۔ وضو کیا نماز پڑھی اور پھر وہیں سو رہا شیرینو بچاری تمام دن انتظار کرتی رہی —— جب وہ نہ آیا تو قلعہ کی دیوار پر گئی۔ اور خادی کو سویا ہوا پایا —— رسوائی کے ڈر سے اس نے اسے آواز تو نہ دی، البتہ پانی کا ایک کٹورا پھینکا۔ پانی کے چھینٹوں سے خادی کی آنکھ کھل گئی۔ شیرینو نے اسے اپنے حنائی ہاتھوں سے گھر آنے کا اشارہ کیا —— لیکن خادی خان نے جیسے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ شیرینو نے غصے سے اپنے ہونٹ چبالئے۔

شام کو باز محمد گاؤں سے واپس آیا تو خادی خان کو گھر پر نہ پا کر حیران ہوا۔ شیرینو نے بتایا۔ کہ وہ بیمار ہے۔ اور مسجد میں پڑا ہے۔ اور جب وہ اسے مسجد میں دیکھنے گیا۔ تو وہ سچ مچ بیمار تھا۔

دوسرے دن صبح جب خادی خان سندیں لے کر رخصت ہوا۔ تو خدا کا شکر بجا لایا۔ کہ اس نے اسے ثابت قدم رکھا۔ وہ بیماری کی حالت میں چلا تھا۔ راستے میں تکلیف بڑھ گئی۔ لیکن اس حالت میں اس نے سفر جاری رکھا۔ دل آرام کے مقام پر پہنچ کر ایک جھونپڑے میں بے سکت ہو کر گر پڑا۔ پیاس کی شدت سے زبان

پر کاٹنے آگئے تھے۔ وہ اسی کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ اتفاق سے ایک مسافر کا گذر ادھر سے ہوا۔ جس کے ہاتھ خادی خان نے اپنے گاؤں میں پیغام بھجوایا۔

خادی خان کی بیماری کی خبر نے سارے گاؤں میں کہرام مچا دیا۔ اور سب سے پہلے جو خادی خان کی احوال پرسی کو پہنچی وہ بیبتو ہی تھی۔ لیکن خادی کی روح بیبتو سے پہلے ہی اس کی تلاش میں نکل چکی تھی۔ بیبتو نے اسے جھنجھوڑا ــــــ "خادی خان۔ بولتے کیوں نہیں میں تمہیں اپنے گاؤں لے جانے آئی ہوں۔ اُٹھو، بس ناراضگی ہو چکی"۔ لیکن خادی خان تو سچ مچ روٹھ چکا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہی کر بھی دکھایا۔

خادی خان کا سارا گاؤں، دلآرام میں اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہ آج خادی خان کے پاس جرگہ لے کر آئے تھے۔ لیکن خادی خان کی طرف سے ایک سکوت ہی ان سب کا واحد جواب تھا ــــــ آخر خادی خان کو اس کی مرضی کے خلاف یہ جرگہ اس کے گاؤں لے گیا ــــــ نقاروں اور دماموں کے ساتھ نہیں بلکہ اشکوں آہوں کے جلوس! دربین اور نوحوں کے لشکر کے ساتھ ــــــ

جب قبر میں خادی خان کو اتارا گیا تو، بیبتو نے جرگے کے سامنے ایک درخواست کی ــــــ وہ یہ تھی کہ اسے قبر میں اتر کر خادی خان کو ایک نظر دیکھنے دیا جائے۔ بیبتو کی قابلِ رحم حالت دیکھکر اسے اپنے دستور کے خلاف اجازت مِل گئی۔ بیبتو لحد میں اتر کر خادی خان کی لاش سے لپٹ گئی۔ جب روتے روتے اس کا گلا بیٹھ گیا اور وہ خاموش ہو گئی تو اس کے باپ نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا لیکن وہاں بیبتو کی جگہ اس کی بے رُوح لاش پڑی تھی ــــــ

مومن خان شیرنیو

یہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔ کہتے ہیں روہستان کے ایک گاؤں میں دو بہت بڑے خان رہا کرتے تھے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی تھے ــــ بڑا بھائی قبیلے کا سردار تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے ــــ بڑے بیٹے کا نام زبردست تھا ــــ دوسرے بھائی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کا نخلِ حیات بے ثمر تھا ــــ ایک دن وہ بہت مغموم بیٹھا تھا۔ بھائی نے وجہ دریافت کی لیکن اس نے ٹال دیا ــــ بھائی سمجھدار تھا وہ جان گیا کہ یہ اولاد کے لئے خفا ہے ۔ اس نے چھوٹے بھائی کو تسلی دی: "خدا کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جب اللہ پاک تمہیں اولاد کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔"

حسنِ اتفاق سے اسی سال دونوں بھائیوں کی بیویوں کے نخلِ امیدیں بیک وقت ثمر لگے۔ دونوں نے سجدہ شکر ادا کیا۔ بڑے بھائی نے چھوٹے سے کہا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میرے ہاں لڑکی اور تمہارے گھر لڑکا ہوا۔ تو میں یہ لڑکی تمہارے لڑکے کو دونگا۔ اور اگر تمہارے گھر لڑکی اور میرے ہاں لڑکا ہوا۔ جب بھی ان دونوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دینگے۔ دن گذرتے گئے اور آخر وہ گھڑی آئی جب دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی بندوقیں بھر لیں تاکہ جس کے گھر میں لڑکا پیدا ہو وہ اس خوشی میں

فائر کئے جائیں ــــــ چھوٹے بھائی کے ہاں لڑکا اور بڑے کے ہاں لڑکی ہوئی اور اس خوشی میں چھوٹے نے باپ اور بڑے نے چچا کی حیثیت سے ایک ساتھ فائر کئے۔ فضا گونج اٹھی گاؤں اور قبیلے میں دھوم مچ گئی۔ ڈوم ڈھالیوں نے رقص و سرود کا اکھاڑا جمایا۔ ایک طرف سات بھائیوں کی ایک بہن اور دوسری طرف اکلوتا بیٹا ــــــ غرض دونوں بڑے خوش تھے۔ لڑکی کا نام شیرینو اور لڑکے کا مومن خان تجویز ہوا۔ اور دونوں بھائیوں نے اپنے عہد کو قبیلے کے سامنے دہرایا اور اعلان کر دیا کہ شیرینو اور مومن کا رشتہ ابھی سے طے پا گیا ہے۔ یہ دونوں نہ صرف چچا زاد ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کے منگیتر بھی ہیں۔

بچپن کے کھیل شیرینو اور مومن ایک ساتھ کھیلے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ اکٹھے کھاتے پیتے اور اکثر اکٹھے ہی سونے کے لئے بالک ہٹ پر اُتر آتے ــــــ دونوں بھائی ان کے باہمی لگاؤ کو دیکھکر خوش تھے۔ آخر قضا نے دونوں بھائیوں کو قبیلے سے چھین لیا۔ مومن اور شیرینو نے باپ کی جدائی کو بُری طرح محسوس کیا۔ اُنہوں نے رو رو کر اپنی جان ہلکان کر دی۔

والد کی وفات کے بعد بڑے بھائی کی اولاد میں قبیلے کی سرداری کیلئے جھگڑا شروع ہو گیا۔ ساتوں بھائی دعویدار تھے ــــــ اور جب قبیلے کا جرگہ بلایا گیا تو جرگے نے کہا کہ تم سارے بھائی آپس میں مل کر جو فیصلہ کر لو۔ وہ ہمیں بھی منظور ہو گا۔

مومن خان نے بھی جرگے کے سامنے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ کہ میرا چچا بڑا سردار تھا۔ اس کے بعد قبیلے کی سرداری میرے باپ کے حصے میں آئی۔ اور اس

لحاظ سے اپنے باپ کے منصب کا بھی حقدار ہوں۔ چونکہ مومن خان اپنے چچیرے بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین، قابل اور شریف تھا۔ لہٰذا نصف قبیلے نے اسکی طرف داری شروع کر دی۔ ــــ اب نصف قبیلے کی سرداری مومن خان کے پاس تھی اور نصف کی زبردست خان کے پاس ــــ

مومن خان کو یہ سرداری بڑی مہنگی پڑی۔ زبردست خان اور اس کے بھائی مومن خان سے جلنے لگے۔ اس کی مقبولیت انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی ــــ مومن خان تو صاف دل تھا اس نے بھائیوں کی اس بے اعتنائی کی پروا نہ کی لیکن اس کی ماں نے ایک دن اسے سمجھایا۔ " بیٹا مومن، تربوروں کے دلوں میں سوائے کینے اور دشمنی کے اور کچھ نہیں ہے۔ وہ تمہاری راہ میں کانٹے بو رہے ہیں۔ زبردست خان کو اپنے چھ بھائیوں پر بڑا ناز ہے۔ وہ تجھے چیونٹی کی طرح مسل دینگے ــــ تم قبیلے کے بڑے بوڑھوں کو زبردست خان کے پاس بھیجکر شیرینو کی شادی کے متعلق بات چیت کر لو۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔" اگر شیرینو کا نام بیچ میں نہ ہوتا تو شاید مومن خان ماں کی ان باتوں کو اہمیت نہ دیتا۔ اس نے سوچا شیرینو کے لئے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اور پھر اس نے قبیلے کے بزرگوں کا ایک جرگہ تیار کر کے زبردست خان کے پاس بھیجا ــــ اور جب اس جرگے نے زبردست خان سے شیرینو کی طلبی کی تو وہ صاف مکر گیا۔ اس نے کہا کہ نہ تو ہمارے باپ نے شیرینو مومن خان کو دی تھی اور نہ ہی ہم ایسا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جرگے نے کہا تمہارے والد نے سارے قبیلے کے سامنے اعلان کیا تھا۔ ہم سب اس بات کے گواہ ہیں۔ اور پھر سارا قبیلہ تیرے پاس بطور جرگہ آیا ہے۔ پختون روایات اور دستور کے خلاف

اگر تو نے قبیلے کے اتنے بڑے جرگے کو ناکام واپس لوٹایا۔ تو برا ہوگا۔ زبردست خان نے حالات بگڑتے دیکھے تو کہا میں اس شرط پر یہ رشتہ منظور کر سکتا ہوں کہ میرے باپ کی چاندی کی ڈھال جس کا وزن ایک من ہے۔ اور ہمارے ورثے میں چلی آرہی ہے۔ اس قسم کی بارہ ڈھالیں یعنی بارہ من چاندی مومن خان مہیا کرے۔ اور جب جرگے نے یہ شرط منظور کر لی ——— تو زبردست خان کا منہ کھلا رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ جرگہ اتنی کڑی شرط قبول نہیں کرے گا۔ "نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی"۔ لیکن اب وہ مجبور تھا۔ پٹھان جب ایک دفعہ وعدہ کر لے تو پھر اس سے نہیں پھرتا۔ بہر حال اس نے جرگے کو خوشی خوشی رخصت کیا۔

اور جب قبیلے کے بزرگوں نے مومن خان کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو اس کا چہرہ غصّے سے لال ہوگیا ——— باپ نے شیرینو مفت دی تھی۔ اور لڑکے بہن کو فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے ان کی غیرت پر اس نے دل ہی دل میں کہا۔ لیکن میں بارہ من چاندی کہاں سے لاؤں گا ——— اس کا مطلب ہے کہ اپنے وطن اپنے ملک اور قبیلے کو چھوڑ کر ہندوستان چلا جاؤں! ۔ وہاں نوکری کر دوں! اور شیرینو کو حاصل کرنے کے لئے بارہ من چاندی پیدا کروں۔ لیکن کچھ بھی ہو اب تو جانا ہی پڑے گا ——— اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

مومن خان سفر کی تیاریاں کرنے لگا کسی نے شیرینو کو خبر کر دی۔ دنیا اس پر تاریک ہوگئی۔ وہ بھائیوں سے چوری مومن خان کے ہاں گئی۔

"اے میرے سرتاج! تو سفر کے لئے کمر باندھ رہا ہے۔ تم نے موزے چڑھا لئے ہیں ——— لیکن یہ پھولوں بھرا باغ کسے سونپے جا رہے ہو۔ کہیں خزاں

کے منحوس جھونکے اسے تاراج نہ کر دیں۔"

"یہ باغ خدا کے حوالے ہے۔ وہی اس کا رکھوالا ہے۔ اگر خزاں نے اس باغ کو تاراج کرنے کی کوشش کی تو میں آ کر خزاں کے ہاتھ قلم کر دونگا۔ شیرینو! تمہارے بھائی نے تمہارے عوض بارہ من چاندی مانگی ہے۔ اب میں ہندوستان سے یہ چاندی لا کر تجھے حاصل کر دونگا۔"

"میرے بچپن کے ساتھی مومن! تم ہندوستان جا رہا ہے لیکن سنتی ہوں وہاں کی لڑکیاں بڑی چالاک اور طرار ہوتی ہیں وہ جوانوں پر جادو کر دیتی ہیں۔ وہ کہیں تمہیں بہکا کر مجھ سے چھین نہ لیں۔ اگر ایسا ہوا تو تو اپنے قبیلے کو کیا منہ دکھائیگا۔ پختون تو اپنی ناموس کبھی نہیں چھوڑتا۔ مومن خان۔ تربوروں کو مذاق اڑانے کا موقع نہ دینا۔"

"پیاری شیرینو، ہندوستان کی تمام لڑکیاں میری بہنیں ہیں۔ وہ مجھے کبھی نہیں بہکا سکتیں۔ ان کا ملیح حسن تیرے صبیح چہرے کی برابری نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ شیرینو نے اس کی راہ میں آنسوؤں کے موتی بچھائے اور دعاؤں کے پھول نچھاور کئے۔ اس نے کہا ——

"مومن خان۔ میرا محبوب۔ قبیلے کا سردار۔ گھوڑے پر سوار جا رہا ہے۔ اور میرے گلابی عارضوں پر آنسوؤں کا سیلاب جاری ہے —— اے کابے کوسوں دور جانے والے محبوب اگر تیرا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو ذرا میرے سبز خالوں کو دیکھتا جا۔ ہندوستان کی لڑکیوں کے خال سبز نہیں ہوتے۔ میرے یہ سبز خال اور کالی زلفیں تیری امانت ہیں۔ اگر کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھائی۔ تو میں اسکی آنکھوں میں تکلے گھونپ دونگی —— اے مسافر محبوب غریب الوطنی کی تنہائی میں گھبرا نہ جانا میرے

بوسوں کا خزانہ تیرے ہی لئے محفوظ ہے ـــــ رمضان کے فاقوں کے بعد ہی عید آتی ہے۔"

سارا قبیلہ مومن خان کو الوداع کہنے ـــــ گاؤں کے باہر منتظر تھا۔ قبیلے کے بزرگوں نے اسے بہترا سمجھایا۔ کہ عزم سفر ترک کر دو۔ لیکن وہ بولا۔ جرگے نے جو شرط منظور کی ہے اسے پورا کرنا میرا فرض ہے۔ ورنہ ترپوروں کی نظروں میں میرے قبیلے کی کوئی وقعت نہ رہے گی۔ وہ گاؤں والوں سے رخصت ہوا تو اس کا وفادار دوست ریدی گل خان اس کے ساتھ ہو لیا۔ دن گذرتے گئے۔ راتیں بیتتی گئیں۔ منزلیں طے ہوتی رہیں۔ کہاں جا رہے ہیں۔ ان دو مسافروں کو کچھ علم نہیں تھا۔ منزل کا تعین کئے بغیر غریب الوطنی کے کانٹوں کو پاؤں کے چھالوں سے سیراب کرتے ہوئے جا رہے تھے ـــــ ایک طویل سفر کے بعد وہ ہندوستان کے ایک شہر میں پہنچے۔ جہاں یہ رواج تھا کہ وہاں کے باشندے اپنے چہروں پر نقاب ڈالے رہتے ـــــ ریدی گل نے مومن خان سے کہا۔ کہ تم بھی اپنے چہرے پر نقاب ڈال لو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری خوبصورتی کوئی گل کھلائے۔ مومن خان نے ایسا ہی کیا۔ بازاروں کی چہل پہل میں جب مومن خان نے شاہی فوج کے سپاہیوں کو دیکھا۔ تو اس کے دل میں یہ ہوس چٹکیاں لینے لگی۔ کہ اے کاش میں بھی لاؤ لشکر کا مالک ہوتا۔ اس خیال کے آتے ہی اُس نے بغیر سوچے سمجھے چہرے سے نقاب اٹھا لیا ـــــ اچانک ایک پہرے دار کی نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ اس کے حسن سے بے حد متأثر ہوا۔ اسی محویت کے عالم میں اس نے ٹھوکر کھائی اور اپنا ہی اس کے نیزہ بیٹے میں گڑ گیا۔

یہ تماشا دیکھ کر ریدی گل نے مومن خان کا نقاب زبردستی اس کے چہ...

پر ڈال دیا۔ اور جلدی جلدی بازار سے نکل کر ایک سرائے میں جا مقیم ہوئے۔

پہرے دار کا حادثہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ آن کی آن میں یہ خبر سارے شہر میں پھیل گئی ـــ تحقیقات ہوئی تو پہریدار نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ اور جب یہ خبر بادشاہ تک پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اس اجنبی کو فوراً حاضر کیا جائے۔ جب حکومت کے ہرکارے تلاش کرتے کرتے سرائے میں آئے۔ تو مومن خان کو دیکھ کر حیران رہ گئے ـــ مومن خان نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی۔ اور جب اُنہوں نے شاہی فرمان اسے دکھایا۔ تو فوراً ریدی گُل کو ساتھ لے کر دربار میں حاضر ہوا ـــــ اگرچہ دربار شاہی کے جاہ و جلال نے مومن خان کو بڑا متاثر کیا۔ لیکن مومن خان کی شکل و صورت اور حسن و جمال سے شاہ بھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہا۔ شاہ نے مومن خان کو مسند پر اپنے پاس بٹھالیا ـــــ اور اس کا نام پتہ پُوچھا تو اس نے بتایا کہ میں شمال مغرب کی طرف سے آیا ہوں اور فلاں ملک کا بیٹا ہوں۔ بادشاہ یہ سُن کر بڑا خوش ہوا اور اسے اپنے محل میں ٹھہرایا۔ مومن خان بڑے آرام میں تھا۔ اگر اسے کوئی چیز ستا رہی تھی۔ تو وُہ شیرینو کی یاد تھی ـــــ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک پیر مرد سبز پوش اسے کہہ رہا ہے کہ "اُٹھ اور پہلوانی کر" جب وُہ بیدار ہوا۔ تو اس نے سوچا۔ اس خواب کا کوئی مقصد ضرور ہے۔ چنانچہ دوسرے دن اس نے شاہ کی خدمت میں عرض کی۔ کہ اپنے پہلوانوں میں سے ایک پہلوان کو حکم دیجئے کہ وہ میرے ساتھ زور آزمائی کرے۔ شاہ نے مسکرا کر کہا۔ مومن خان تم میرے مہمان ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ تم اس قابل نہیں کہ اتنے زبردست پہلوان کے ساتھ زور آزمائی کرسکو۔ اگر خدانخواستہ کہیں ہڈی پسلی ٹوٹ گئی۔ تو میری بدنامی کا باعث ہوگا۔ لیکن مومن کا اصرار بڑھتا ہی گیا۔ آخر شاہ نے مجبور ہو کر ایک پہلوان منگوایا۔

تماشے کے لئے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے۔ اور جب دونوں اکھاڑے میں اُترے تو بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی ۔ اسے خطرہ تھا کہ مومن خان آج ضرور اپنی ہڈی پسلی تڑوا بیٹھیگا ۔ اسے مومن کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ وُہ دل ہی دِل میں اس کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگ رہا تھا۔ اچانک سب لوگ یہ دیکھکر حیران ہو گئے کہ مومن خان نے شاہی پہلوان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے سر سے اوپر اٹھالیا اور اسے چکر دینے لگا۔ شاہی پہلوان کو مومن خان نے آہستہ سے زمین پر چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ مومن خان کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اب تو شاہ بہت خوش تھا کہ اسے بیٹھے بٹھائے مفت میں ایک زبردست پہلوان مِل گیا ہے ______

درباریوں میں مومن خان کو شاہ کے دائیں طرف کرسی ملی ہوئی تھی۔ اور اب تو اسے شاہ کے مزاج میں بھی کافی دخل حاصل ہو چکا تھا۔ ایک دن بادشاہ کی خدمت میں ایک خط پیش کیا گیا۔ شاہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ یہ خط مومن خان دیکھے لیکن اس کے اصرار پر یہ خط اسے دکھانا ہی پڑا۔ اور جب مومن نے وہ خط پڑھا تو بگڑ گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہا" کس کی مجال ہے جو ہمارے بادشاہ سے خراج کا مطالبہ کرے۔ میں یہ باج ہرگز نہ دینے دونگا"

شاہ نے کہا نہیں ہم باج اپنی خوشی سے دیتے ہیں۔ لڑنے کی ضرورت نہیں لیکن مومن خان نے کہا۔ میرے ہوتے یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا۔ جب مومن خان کسی صورت نہ مانا تو شاہ نے مجبوراً اسے رخصت کیا۔ اس نے صرف ریدی گل کو ساتھ لیا۔ اور دوسرے ہی دن علی الصباح روانہ ہو گیا۔

جب وہ باج گیر شاہ کے شہر میں وارد ہوا تو سب سے پہلے ایک سُنار

کے پاس گیا اور اسے حکم دیا کہ اس کے گھوڑے کے لئے سونے کے نعل بنا دے پہلے تو زرگر سمجھا کہ یہ جوان مذاق کر رہا ہے۔ لیکن جب ریدی گل نے اسے آنکھیں دکھا کر کہا۔ "کیا تو ہمیں مسخرا سمجھ رہا ہے۔ جلدی بناؤ نعل ورنہ ابھی میرا آقا تمہیں اٹھا کر زمین پر دے پٹکے گا۔" تو اس نے نعل بنانے شروع کر دیئے۔

مومن خان بازار کی گھما گھمی کے تماشے میں مگن تھا کہ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی اونٹ پر سوار چلی جا رہی ہے۔ لیکن وہ بڑی پریشان و مضطرب ہے اور نہایت بلند آواز سے فریاد کر رہی ہے۔

"اے لوگو مجھکو میرے باپ کے ظلم سے بچاؤ"۔ اور لوگ بڑی ہمدردی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ "شہزادی ہم تیری مدد ضرور کرتے۔ لیکن تیرے منگیتر کی موجودگی میں کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وُہ تمہاری مدد کرے"!

مومن خان کا دل اس عورت کی فریاد سے پسیجا۔ اس نے سنار سے صورت حال دریافت کی تو سنار نے کہا۔ "بدقسمتی سے ایک اژدہے کو شہر کا راستہ معلوم ہو گیا ہے۔ وُہ ہر روز ایک اونٹ اور ایک لڑکی کی قربانی لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شہر میں آ کر تباہی مچاتا ہے۔ آج بادشاہ کی لڑکی کی باری ہے۔ آج یہ بچاری اژدہے کی خوراک بنے گی۔ اس کا منگیتر وُہ سامنے کھڑا ہے۔ وزیر زادہ۔ لمبا تڑنگا بزدل"۔۔۔

یہ عالم دیکھ کر مومن خان کو شیرینو یاد آ گئی۔۔۔ شیرینو اس کے سامنے پریشان حال کھڑی تھی۔ وہ اسے اپنے سبز خال اور کالی زلفیں دکھا دکھا کر بلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی گر رہے تھے۔ اس کا پھول ایسا چہرہ

کملا گیا تھا ـــــــ اور مومن خان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وُہ اسی خیال میں کھو گیا اسے تن من کی سدھ تک نہ رہی ـــــــ شہزادی کا اونٹ سنار کی دکان تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر فریاد کی اور مومن خان کی محویت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور سامنے کھڑی ہوئی شیریں تھی اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں تحلیل ہو گئی۔

"میں اسے بچاؤنگا۔ یہ بھی آخر شیریں کی طرح ایک بے بس عورت ہے"
یہ کہتے ہوئے مومن خان اونٹ کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ شہر سے باہر پہنچکر ساربان نے اونٹ کی مہار چھوڑ دی۔ اور واپس لوٹ آیا ـــــــ اب مومن خان نے آگے بڑھکر اونٹ کی مہار پکڑ لی۔

شہزادی نے سوچا۔ شائد اژدھا اپنا روپ بدل کر آگیا ہے۔ اس نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر اونٹ سے نیچے گر پڑی۔ جب اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے بدستور مومن خان کو کھڑا پایا۔ اسے ذرا تسلی ہوئی ـــــــ مومن خان نے شہزادی سے کہا۔" خاتون گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں بچانے آیا ہوں۔ اب اژدھا نہیں نگل سکتا۔ تم سامنے چشمے کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں یہاں اژدھے کا انتظار کرونگا۔ اگر مجھے نیند آگئی تو جگا دینا ـــــــ مومن خان ایک چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ رہا ـــــــ شہزادی کے دل میں مومن خان کے لئے پیار کے جذبات نے جنم لینا شروع کیا۔" کتنا خوبصورت ہے یہ جوان، کتنا بہادر ہے کتنا نڈر ہے۔ موت کے منہ میں بھی آرام سے سو رہا ہے۔ اس کے لئے پتھروں کا سرہانہ نہیں چاہیئے۔
"وہ اُٹھی آخر میں کب اس کے کام آؤنگی" یہ سوچ کر اس نے مومن خان کا سر اپنی ریشمیں رانوں پر رکھ لیا۔ اتنے میں سرسراہٹ سی شروع ہوئی اور ایک عظیم اژدھا

دور سے رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ اس اژدھے کو دیکھتے ہی شہزادی کا خون خشک ہو گیا۔ آواز اس کے حلق میں اٹک گئی۔ دہشت نے اس کے قوئی پر غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ پتھر کی مانند جامد و ساکت ہو گئی۔ لیکن آنکھوں نے اس کا ساتھ دیا۔ "ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے مومن خان کے رخساروں پر گرے۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنے سر کو شہزادی کی رانوں پر پا کر بڑا غصہ آیا۔ لیکن اژدھا کو دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے اُٹھا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے تلوار کو اپنے پاؤں سے باندھا۔ اور پھر اژدھا کے مقابلے میں ڈٹ گیا ــــ اژدھا پھنکارتا۔ جھاگ اڑاتا آ رہا تھا۔ جب وہ مومن خان پر حملہ آور ہوا تو اس نے اپنی ٹانگ اس کے منہ میں دے دی۔ اژدھا اس کی ٹانگ کو چبانا چاہتا تھا۔ لیکن تلوار اس کے منہ کو چیرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اژدھا دو ٹکڑے ہو کر ٹھنڈا ہو گیا۔ مومن کو کوئی گزند نہ پہنچا ــــ اُس نے شہزادی کو آواز دی اور جب وہ آئی تو اس نے اژدھے کو زمین پر ڈھیر پایا۔ مومن خان نے اژدھے کے سر سے پاؤں تک ایک لمبا تسمہ کاٹا اور شہزادی سے کہا تم اونٹ پر سوار ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ اگر کسی نے پوچھا کہ اژدھے کو کس نے مارا ہے تو کہہ دینا جس کے پاس اس کا تسمہ ہے۔ یہ کہہ کر مومن خان سنار کی دکان پر نعل بنوانے چلا گیا۔ شہزادی ایک ٹیلے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی، اسے توقع تھی کہ محل سے کوئی نہ کوئی اس کی خبر کو آئیگا۔

شاہی محل میں شہزادی کے چلے جانے سے کہرام برپا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ نے شہزادی کی صف ماتم بچھا رکھی تھی۔ انہیں یقین ہو چکا تھا۔ کہ شہزادی اژدھے کی نذر ہو چکی ہوگی ــــ ماں کی ممتا نے بے چین ہو کر ایک ملازم کو حکم دیا کہ اگر اژدھا چلا گیا ہو اور شہزادی کی کوئی نشانی وہاں رہ گئی ہو تو اسے جا کر لے آؤ۔ جب شاہی ملازم

مقام معین پر پہنچا۔ تو وہ شہزادی کو دیکھ کر حیران ہو گیا ـــــ لیکن اژدھے کو دیکھتے ہی بدحواس ہو کر بھاگ نکلا ـــــ شہزادی کو اس کی بزدلی پر بڑی ہنسی آئی۔ اس نے اُسے آواز دی او بزدل یہ اژدہا نہیں اس کی لاش ہے ـــــ واپس آؤ۔

شاہی حرم ماتم سرا بنا ہوا تھا۔ شہزادی نے جونہی قدم رکھا۔ لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ خوشی کی ایک لہر چاروں طرف دوڑ گئی۔ بادشاہ سمجھا شاید شہزادی نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ اور راستے ہی سے واپس آ گئی ہے۔ اس نے غضبناک ہو کر شہزادی کو ڈانٹا۔ لیکن فوراً شاہی ملازم کورنش بجا لایا اور عرض کی کہ "حضور کے بخت نے یاوری کی اور غلام نے اژدھے کے دو ٹکڑے کر دیئے ـــــ یہ شہزادی اور اونٹ صحیح وسلامت حاضر ہیں" ـــــ

شہزادی نے جب یہ سنا تو مارے غصے کے آپے سے باہر ہو گئی۔ اور بلند آواز سے کہا۔ "ابا حضور اژدھے کو اس بزدل نے نہیں مارا۔ بلکہ اس شخص نے مارا ہے جس کے پاس اس کا تسمہ ہے"۔ بادشاہ کو پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ "تم دونوں جھوٹ کہتے ہو۔ مجھے ثبوت چاہیئے وہ شخص کہاں ہے جس نے اژدھے کا کام تمام کیا" شہزادی نے کہا۔ "وہ بہادر جس نے ہماری سلطنت کو اس بلا سے نجات دلائی سنار کی دکان پر ہے۔

جب مومن خان کو بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔ تو اس نے کہا "بادشاہ سلامت اژدھے کو میں نے مار کر شہزادی کی جان بچائی ہے اور ثبوت میں یہ تسمہ حاضر ہے"۔ بادشاہ نے ممنون نگاہوں سے مومن خان کی طرف دیکھا۔ "کتنے بہادر ہو تم اے نوجوان کاش میری سلطنت میں بھی ایسے بہادر ہوتے" ـــــ اب کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس شہزادی کا ہاتھ پکڑے۔ میں اپنی لخت جگر اور نصف سلطنت تمہیں بخشتا ہوں۔"

"بادشاہ سلامت۔ میں آپ کی ذرہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے نہ تو شہزادی چاہیئے اور نہ سلطنت۔ البتہ آپ اپنے پڑوس کے بادشاہ سے جو باج ہر سال وصول کرتے ہیں اسے معاف کر دیجئے۔ کیونکہ یہ باج ناجائز ہے"۔

"لیکن وہ باج تو ان پہلوانوں کی قیمت ہے۔ جو ہم نے اسے دے رکھے ہیں"۔

"حضور گستاخی معاف۔ ان پہلوانوں کو میں آزما چکا ہوں۔ انہیں پہلوان کہنا پہلوانی کی توہین ہے"۔

"اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہو گیا ہے۔ کیونکہ اژدھے کی اس بلا سے وہ پہلوان بھی خلق خدا کو نجات نہ دلا سکے"۔ "فکر نہ کرو — تم ہمارے محسن ہو۔ تمہاری خاطر ہم یہ باج معاف کئے دیتے ہیں۔ لیکن شہزادی کو تمہیں قبول کرنا ہو گا"۔

اور مومن خان نے مجبوراً اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا — شادی کے بعد جب تخلیئے میں دونوں اکٹھے ہوئے تو مومن خان نے کہا — "شہزادی، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔ میں شیرینو کے ساتھ وعدہ کر چکا ہوں۔ اور مرد اپنے قول کا پابند ہوتا ہے۔ تم مجھے معاف کرنا — یہ تلوار تمہارے اور میرے درمیان منصف ہے۔ اگر میں کوئی دست درازی کروں تو تمہیں اختیار ہے کہ میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو — ورنہ یہی تلوار اژدھے کی طرح تمہارا کام بھی تمام کر سکتی ہے"۔

"میرے سرتاج تمہارا کہنا میرے سر آنکھوں پر۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے"۔ اور پھر دوسرے دن مومن خان خراج شاہی کا معافی نامہ لے کر شہزادی کو کرلاتا چھوڑ گیا۔

گاؤں چھوڑنے کے بعد مومن خان کے تربوروں سے سارا قبیلہ متنفر ہو گیا تھا۔ انہوں نے زبردست خان کی زبردستی کے خلاف احتجاج کیا۔ زبردست اور اس کے بھائیوں نے قبیلے پر سختی شروع کر دی۔ وہ قبیلے کے با اثر لوگوں کی توہین کرتے، انہیں خاطر میں نہ لاتے، اور جب انہوں نے مومن خان کی ماں کو گھر سے نکال باہر کیا۔ اور مومن خان کی زمین اور گھر بار پر قبضہ جما لیا تو قبیلے میں ان کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔

گاؤں کا ایک یتیم بچہ ماجتے جو مومن خان کی ماں کا لے پالک تھا۔ ایک اور گاؤں میں کسی خان کے ڈھور ڈنگر چراتا تھا۔ ایک دن چرتے چرتے یہ ڈنگر زبردست خان کے کھیتوں میں جا نکلے۔ زبردست کے چرواہے بھی بڑے تیز تھے۔ انہوں نے ماجتے کو خوب پیٹا —— اور جب ماجتے روتا پیٹتا ماں کے پاس آیا تو اس نے اسے سینے سے لگایا اور کہا بیٹا تیری ماں پر بھی زبردست کی زبردستیوں نے دنیا تنگ کر رکھی ہے۔ جا تو بھی اپنے بھائی مومن خان کے پاس ہندوستان چلا جا۔ —— اسے کہنا کہ تیری ماں لقمے لقمے کے لیئے ترس رہی ہے۔ قبیلے کے لوگوں نے اسے پناہ دی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو شائد یہ مر گئی ہوتی —— اور آخر ماجتے نے بھی گاؤں چھوڑ دیا۔ ہندوستان پہنچکر ماجتے بھی اتفاق سے اسی بادشاہ کی قلمرو میں پہنچا۔ جہاں مومن خان درباری تھا ——

جب مومن خان خراج کا معافی نامہ لے کر آیا۔ تو ساری قلمرو میں خوشیاں منائی گئیں۔ اور بادشاہ نے مومن کو گلے لگایا۔ اس کی پیشانی اور گردن پر بوسے دیئے —— مومن خان نے اپنے بھائی ماجتے کو دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سمایا اور

کہا جانی سچ سچ بتاؤ۔ میرا گاؤں کیسا ہے؟ کیا میری شیر تو اچھی ہے۔ اور ہاں میری پیاری ماں کا کیا حال ہے۔ میرے باغ کی کیفیت سنا اپنے باغ کا بوٹا بوٹا میں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اور جب ماجھتے نے مومن کو زبردست خان کے مظالم کی داستان سنائی تو مومن خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ فوراً دست بر قبضہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا ——"بادشاہ سلامت میں ابھی جاؤنگا۔ مجھے اجازت دیجئے۔ میرا ناموس خطرے میں ہے۔"

"بڑی خوشی سے جاؤ مومن خان۔ جتنی فوج ضرورت ہو اپنے ساتھ لے جاؤ، باقی کمک بھی بھیجی جائیگی۔"

"شکریہ بادشاہ سلامت ہم تین ہی کافی ہیں۔ تربوروں کی بساط ہی کیا ہے"

بادشاہ نے خزانچی کو حکم دیا کہ سات بوریاں سونے چاندی کی بھر کر مومن خان کے ساتھ بھیجی جائیں۔ شاہی نوکر چاکر یہ سب سامان لے کر مومن خان کے ساتھ روانہ ہو گئے ——

مومن خان کے بعد شہزادی کی حالت ابتر ہو گئی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اور ہر وقت روتی رہتی۔ بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی —— شہزادی نے کہا۔" اباجان مجھے اجازت دو تاکہ میں اپنے سرتاج کے پاس جاؤں۔" شاہ نے مجبوراً اسے رخصت کیا۔ شہزادی اپنے ساتھ انتالیس حسین و جمیل کنواری خوامیں اور بہت سا مال و دولت لے کر روانہ ہو گئی۔ لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی جب اس نے سنا کہ مومن خان اپنے وطن چلا گیا ہے۔ شہزادی نے مع اپنے حشم و خدم کے مومن خان کے ساتھیوں کو جا لیا۔ لیکن مومن خان کو وہاں بھی نہ پا کر سخت حیران ہوئی۔ مومن خان،

کے ساتھیوں نے شہزادی کی خوب آؤ بھگت کی۔ اور وہ نہایت بے چینی سے اپنے محبوب کا انتظار کرنے لگی۔

مومن خان نے اپنے گاؤں سے تھوڑی دور ڈیرا ڈالا اور ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر اکیلا گاؤں گیا۔ زبردست خان نے شیریں بیبو بچاری پر بڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ وہ اسکی بڑی حفاظت کرتا تھا کہ کہیں وہ مومن خان کے پیچھے ہندوستان نہ بھاگ جائے رات کو ساتوں بھائی اپنی چارپائیاں اس کے گرد ڈال کر سوتے ______

مومن خان جب گاؤں میں داخل ہوا تو رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ سارا گاؤں سو رہا تھا۔ ایک بھیانک سناٹا چاروں طرف مسلط تھا جسے کبھی کبھی گیدڑوں کی آوازیں توڑ کر مزید بھیانک بنا دیتیں۔

مومن خان سیدھا ترپوروں کے دروازے پر جا پہنچا۔ گھوڑا باہر درخت کے ساتھ باندھ دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوا ____ اس نے دیکھا کہ اس کا چاند بادلوں میں گھرا ہوا ہے ____ شیریں بیبو جوانی کی نیند میں مست و الست بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ مومن خان سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ دوڑ کر شیریں بیبو سے لپٹ گیا۔ اور اس کے دہکتے ہوئے رخساروں پر محبت کی مہریں ثبت کرنے لگا ____ شیریں بیبو اس اچانک افتاد سے ڈر گئی۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ اور دوسرے لمحے اندھیرے میں اس کے ساتوں بھائی مومن خان پر ٹوٹ پڑے ____ چور چور کے شور سے اڑوس پڑوس والے بھی جاگ اُٹھے۔ ____ زبردست خان نے چھرے کا ایک بے دریغ وار کیا۔ جو مومن خان کے جگر میں لگا۔ مومن خان دم بخود تھا۔ وہ نہ تو زبان سے کچھ کہتا اور نہ ہی جواباً حملے کرتا۔ وہ خاموش منہ چھپائے زمین پر پڑا تھا۔ جب زبردست خان نے آگے بڑھ کر اس کے

چہرے سے چادر ہٹائی تو شیر تینو نے پہچان لیا۔ اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ زبرد...
سمجھا شاید مومن خان اپنے ساتھ لشکر لے کر آیا ہے۔ لیکن جب انہوں نے ...
تو مومن خان کا گھوڑا زور زور سے ہنہنایا ——— شیر تینو کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے ...
اسے ہوش آیا تو وہ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگی ——— اس نے اپنا سرخ دوپٹہ مومن خان
پر ڈال دیا ———

مومن خان کی ماں کو کسی نے کہلا بھیجا کہ مومن خان سفر سے واپس آ گیا ہے
جلدی آؤ اسے دیکھ لو۔ نہیں تو وہ واپس جا رہا ہے۔ ماں کے لئے مومن خان کی آمد کی
خبر جتنی بھی خوشی لاتی کم تھی۔ لیکن وہ مومن خان سے اس بات پر آزردہ ہوئی کہ وہ
تربوروں کے گھر کیوں اترا۔ اس نے کہا "مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ مومن خان سفر پر جا کر
اتنا بے غیرت ہو جائے گا۔ کہ وہ اپنے ان تربوروں کے پاس آ کر ٹھہرے گا۔ جنہوں نے
اس کی ماں کو لاوارث بنا کر گھر سے نکال دیا۔ مومن میں تجھے اپنا دودھ نہ بخشوں گی
——— لیکن جونہی وہ گھر میں داخل ہوئی۔ اور اس نے مومن خان کو خون میں نہایا ہوا
پایا تو منہ سر پیٹنے لگی: "ہائے میرا تو خیال تھا۔ مومن ہندوستان سے روپوں کی بوریاں
ریشمیں کپڑے۔ سونے چاندی کے برتن اور شال دوشالے لے کر آئے گا۔ لیکن
افسوس اسے شیر تینو اس نے تو تیرا سرخ دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے۔ مومن میرے بچے
تربوروں نے خوب جہالت کی تیری سات چھریاں تیرے کلیجے میں اتاریں"

مومن خان سسک رہا تھا۔ اس میں بات کرنے کی سکت نہ تھی۔ اس نے ایک
ہاتھ سے اشارے سے ماں کو اور دوسرے سے شیر تینو کو بلایا۔ جب دونوں
اس کے نزدیک آئیں تو اس نے کہا: "جگر میں جو چھری لگی ہے اس میں زہر ...

اور لذت بھی - لذت اس لئے ہے کہ تربور کے ہاتھوں نے چلائی۔ اس ضرب میں کسی غیر کا ہاتھ شامل نہیں"۔ آخری الفاظ کے ساتھ مومن خان نے اپنی جان جہان آفرین کے سپرد کر دی۔

جب زبردست خان نے یہ سنا کہ مومن خان اسی کے وار سے مرا ہے۔ تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اس نے اپنی بہن کو بلا کر اسکی پیشانی پر بوسہ دیا۔ "بہن میری ہٹ نے تیری دنیا تباہ کی۔ مجھے معاف کر دو۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے چھری اپنے کلیجے میں اتار لی۔ اور کہا کہ میرا جنازہ مومن خان کے جنازے کے آگے رکھا جائے۔

جب مومن خان کو اپنے ساتھیوں کو چھوڑے ہوئے کافی دیر گزر گئی تو سب کو تشویش ہوئی۔ شاہزادی سے مزید انتظار نہ ہوسکا۔ اور وہ اپنی خواصوں سمیت مومن خان کے گاؤں کی طرف چل پڑی۔ —— لیکن راہ میں ہی اسے ایک چرواہے کی زبانی سب حال معلوم ہوگیا۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے زمین پر گرے کہ خواصوں نے اسے سنبھال لیا —— شاہزادی کو جب ہوش آیا۔ تو وہ مومن خان کے جنازے میں شریک ہونے کے لئے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہوگی کہ سامنے سے مومن خان کا جنازہ آتا دکھائی دیا —— اس کے پیچھے ایک حسین وجمیل عورت پریشان حال دیوانوں کی طرح جارہی تھی۔

شہزادی نے جنازے کا جلوس رکوا دیا —— اور کہا چونکہ مومن خان کنوارا مرا ہے اس لئے اس کا جنازہ کنواری لڑکیاں ہی اٹھائیں گی۔ سیاہ کپڑوں میں ملبس انتالیس خوبصورت کنواریوں نے مومن خان کا جنازہ اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔

شیر سنو نے بلند آواز سے کہا" مومن خان اپنے وعدے کا پکا نکلا۔ اسے ہندوستانی لڑکیوں سے مال اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ نہ ہی لالچی زلفیں اپنی زنجیروں میں جکڑ سکیں۔ وہ اس بات پر ہندوستان کی لڑکیوں کو اپنی بہنیں سمجھتا" اور پھر وہ شہزادی سے لپٹ گئی۔ دونوں کی کوکھ جل چکی تھی۔ دونوں کے باغ خزاں نے جھلسا دیئے تھے۔ دونوں کی دنیا ویران ہو چکی تھی۔ دونوں کے ارمان اور تمنائیں گھائل پنچھیوں کی طرح کرلا رہی تھیں۔ جب مومن خان کو قبر میں اتارنے لگے تو شہزادی نے کہا اس کنوارے شہزادے کو قبر میں بھی کنواریاں ہی اتاریں گی اور پھر شہزادی اور شیر سنو نے اسے قبر میں اتارا جب کفن کے بند کھول کر اپنے محبوب کا آخری دیدار کرنے لگیں تو شہزادی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اور شیر سنو دیوانوں کی طرح ہنستی ہوئی قبر سے باہر آگئی ——— خواصوں نے شہزادی کو قبر سے باہر نکالا۔ لیکن وہ مومن خان کے پاس جا چکی تھی ——— جب مومن خان کی قبر تیار ہو گئی تو خواصوں نے تمام قیمتی کپڑے اور روپوں کی بوریاں مومن خان کی قبر پر نچھاور کر دیں ———

دیوانی شیر سنو نے مٹھیوں میں روپے بھر کر اپنے بھائیوں کی طرف پھینکنا شروع کیے۔

" زر و مال کے بندو۔ اس لئے تم نے مومن خان کو جلاوطن کیا تھا نا۔ وکم بختو تم نے جتنا مانگا تھا اس سے کہیں زیادہ وہ لے آیا ہے ——— اب اس مال و دولت کو زبردست خان کی قبر میں بھر دو۔ شیر سنو کا جنون اب تیز ہو چکا تھا۔ اس نے چٹانوں اور پتھروں سے اپنا سر ٹکرانا شروع کیا ——— خواصوں نے اسے بہتیرا روکا لیکن اس نے کہا ——— شہزادی نے ہندوستانی عورت ہو کر مومن خان کے ساتھ وفا

کی ——— میں پختون ہوتے ہوئے بے وفائی کروں؟۔ اور پھر گاؤں میں ایک کہرام مچ گیا جب شیرینو نے بھی اسی دن غروب آفتاب سے پہلے پہلے جان دیدی۔

درمیان میں مومن خان کی قبر اور اس کے دائیں بائیں دو کنواری شہزادیوں کی قبریں آج بھی اس محبت کے افسانے کی یاد دلاتی ہیں۔

یوسف کرڑہ مار

سرسبز و شاداب چراگاہوں، سونا اگلتی کھیتیوں اور دودھ بھرے تھنوں والی سینکڑوں بھیڑوں کے باوجود حسین کاکا ہمیشہ مغموم رہتا۔ اس کی ضرب المثل خوشحالی اور جہاں نوازی کے افق پر یاس و اندوہ کے بادل ہر وقت چھائے رہتے۔ حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے ثمردار باغات میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا نخلِ زندگی بے ثمر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ ان چراگاہوں میں کوئی ایسا بچہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتا ہوا دیکھے۔ جسے حسین کاکا کا وارث کہا جائے۔ اس وقت اس کے دِل سے ہوک اٹھتی جب وہ یہ خیال کرتا کہ اس کے مالامال کھیت اس کی حقیقی اولاد کی بجائے "تربوروں" یعنی ایک دادا کی اولاد' کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ اور جب وہ آئینے میں اپنے سفید بال اور گھنی براق داڑھی دیکھتا تو ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتا۔ ساٹھ سال کے طویل عرصے سے اس کے گھر کی چار دیواری نے کسی بچے کے رونے کی آواز نہ سنی تھی ــ دل ہی دل میں قدرت سے گلہ کرتا۔ احتجاج کرتا۔ وہ بظاہر ہشاش بشاش رہتا تاکہ اُس کے "تربور" اس کی اس کمزوری کو بھانپ نہ لیں۔ اگر کوئی اس سلسلے میں اس کے ساتھ ہمدردی جتاتا تو وہ ہنس کر کہتا "خدا کی مرضی اِسی شرت ہے۔ اس کے بھید ہم کیا پائیں۔ اسی میں کوئی بھلائی ہوگی"۔ لیکن یہ غم اُسے

گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر اپنی بے اولادی پر کڑھ رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پیروں فقیروں کے پاس اور خانقاہوں پر زیارت کے بہانے گیا، دعائیں کیں منتیں مانیں اور جب ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اس کے نخلِ تمنا میں پھل آنے والا ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ آخر وہ گھڑی آ پہنچی۔ جب حسین کاکا کے گھر کی دیواروں نے ایک حسین و جمیل بچی کے رونے کی آوازیں سنیں۔ لڑکی کا نام بندئی رکھا گیا۔ دشمنوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ لڑکی ہی تو ہے۔ اصل وارث تو لڑکا ہوتا ہے۔ لیکن حسین کاکا بڑا خوش تھا۔ اس نے لڑکی کو سو لڑکوں کے برابر سمجھا۔ قدرت کو اس کی قدر دانی پسند آئی۔ دوسرے سال بندئی کے لئے قدرت نے ایک بھائی بھی بھیج دیا، چاند ایسا لڑکا۔ اس دن حسین کاکا نے دل کھول کر بندوق کے فائر کئے۔ دوست احباب اور اپنے پرائے سبھوں نے حسین کاکا کی خوشحالی میں اتنے فائر کئے۔ کہ دور دور کے لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید دو قبیلوں میں جنگ ہو رہی ہے۔

بچہ بڑا خوبصورت اور پیارا تھا۔ جس نے دیکھا اس نے کہا یوسف ثانی ہے۔ آخر حسین کاکا نے اس کا نام یوسف ہی رکھ دیا۔ بچپن کے دن ہوا کے جھونکے کی طرح گذر گئے۔ باپ نے اسے مدرسے بھیج دیا۔ اور جب اس نے شباب میں قدم رکھا۔ تو حسن و صورت کے علاوہ علم کے زیور سے بھی آراستہ ہو چکا تھا۔ اس کے حسن و رعنائی کا شہرہ دور دور پہنچ چکا تھا۔ یوسف زئی قبیلے کے اس جوان رعنا کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ترلانڈی گاؤں میں لوگوں کے لئے ایک خاص کشش پیدا ہو گئی۔ شکار کے لئے جو بھی گروہ مارا مارا ترلانڈی میں ضرور پڑاؤ کرتا۔ حسین کاکا کا حجرہ ایسے مہمانوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا۔

حسین کاکا کب تک زندہ رہتا۔ اس کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا لیکن وہ مرتے وقت بڑا خوش تھا۔ اُسے اطمینان تھا کہ جان دیتے وقت اس کے دونوں ہاتھ یوسف اور بندئی کے ہاتھ میں ہیں۔ اپنے وارثوں کے ہاتھ میں۔ اب وُہ لاوارث نہیں تھا، بلکہ مال و دولت کے ساتھ ساتھ اس کا ایک شمشاد قد بیٹا بھی تھا۔۔۔۔ جو اُسے اپنے ہاتھوں قبر میں اتارے گا۔ اور اسکی ایک لڑکی بھی تھی جو "بابا بابا" کر کے اسکی میت پر روئے گی۔ اس کا جنازہ بڑے اہتمام سے اٹھایا جائے گا۔ اس کے پیچھے خیرات اور صدقہ دینے والے موجود تھے۔ وہ مطمئن تھا۔ کہ اس کا لڑکا اپنے باپ کی میت کے ساتھ اس کے شایانِ شان سلوک کرے گا۔

حسین کاکا کی موت کے بعد یوسف آزاد نہ تھا۔ بلکہ اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ زمینداری کی دیکھ بھال، مال جائداد کا تحفظ، ترہوروں اور دشمنوں کی سازشوں اور شرارتوں کا سدِباب۔ ان تمام اُلجھنوں نے یوسف کو بڑی حد تک سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا کہ ان تمام ذمہ داریوں سے وُہ کس طرح عہدہ برآ ہو۔ ویسے وُہ ذہین تھا، عقلمند تھا۔ سارے قبیلے میں اس کی خوش اخلاقی ضرب المثل بن چکی تھی۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح آوارہ نہیں تھا۔ اور نہ اُسے آوارگی پسند تھی۔ وہ اُن کے ساتھ کھیل کود میں بھی حصّہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے ساتھی جب تفریح میں مصروف ہوتے تو یہ ان سے الگ تھلگ ایک طرف کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا۔ یوسف کی اسی خلوت پسندی نے اسے یکہ توسف مشہور کر دیا تھا۔ یعنی تنہا رہنے والا یوسف۔ اس یکسوئی نے اگرچہ یوسف کو ایک حد تک مضمحل بنا دیا۔ لیکن اس نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لی۔ ایکا ایکی اسے شکار سے دلچسپی ہو گئی۔

دُور دور سے جو لوگ بھی کرڑہ مار شکار کے لئے آتے اور یوسف کے حجرے میں شب بسر کر کے صبح شکار کو روانہ ہوتے یوسف بھی ان کے ساتھ ہو لیتا۔ اس غرض کے لئے اس نے دو چُست و چالاک کُتّے پالے۔ وُہ کتّوں کو ساتھ لے کر کرڑہ مار کی طرف جاتا تو گھنگر وؤں کی آواز دور دور تک سُنائی دیتی۔ لوگ سمجھ جاتے کہ یوسف شکار کو جا رہا ہے۔

یوسف کے گاؤں اور شکار گاہ میں تین میل کا فاصلہ تھا۔ راستے میں ایک گاؤں سکندر آباد پڑتا۔ "شیر بانو" اسی گاؤں کے مَلک کی بیٹی تھی۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب، کرڑہ مار کے دامن میں بسنے والی ہزاروں لڑکیوں میں ایک۔ جب یوسف صبح کی ملگجی فضا میں شکار گاہ کی طرف جاتا اور کتّوں کے نقرئی گھنگرو اپنی موسیقی چاروں طرف بکھیرتے تو لوگ باگ مکانوں کے دروازوں، منڈیروں، گلیوں اور حجروں میں کھڑے ہو کر نرالا ندی والے حسین کاکا کے شمشاد قد بیٹے یوسف خان کو دیکھتے، خوش آمدید کہتے۔ وہ ہر ایک کو سلام کرتا، ہاتھ ملاتا، خیریت پوچھتے شکار گاہ کی طرف چلا جاتا۔

ایک دن جب گھنگر وؤں کی خوش آہنگی کو ہوا نے چاروں طرف بکھیرا تو شیر بانو کے دل میں بھی یوسف کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی اور جب اس نے یوسف کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے انگ انگ نے یوسف کو قبول کر لیا۔ اُس کے دل میں ایک کسک سی پیدا ہوئی۔ اس کا رُواں رُواں سپتے الاپنے لگا۔ اس کے دل کی شاداب وادی میں نئی آرزوئیں اور اُمنگیں "اتن ناچ" ناچنے لگیں، اُس نے ایک دولت پالی تھی، لیکن خود کھو چکی تھی۔ یوسف جا چکا تھا۔ ایک کوندا

تھا جو پکا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہوا غائب ہو گیا۔ وہ سدھ بدھ بسرائے بت کی طرح خاموش کھڑی رہی۔ اگر اس محویت کے طلسم کو اس کی ماں کی گرجدار آواز نہ توڑتی تو شاید وہیں کھڑی رہتی۔ اور پھر اس کا معمول بن گیا۔ ہر صبح اٹھتی، گھنگروؤں کی آواز سے اس کے دل کے رباب کے تار جھنجھنا اٹھتے، وہ یوسف کو دیکھتی اور دیکھتی ہی رہ جاتی۔

یوسف بے نیازانہ اس کے ارمانوں کو لتاڑتا ہوا چلا جاتا۔ اس کے ساتھ آنکھیں چار کرنے کی خواہش شیربانو کے دل میں چٹکیاں لیتی، لیکن یوسف، شیربانو کے دل کو تاراج کرتا ہوا بے نیازانہ گزر جاتا۔ شیربانو کے طرز وروش پر اس کی ماں کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے اپنے شوہر سے شیربانو کی محبت کا ذکر کیا۔

ایک دن جب دوپہر کی تپش اپنے شباب پر تھی۔ شیربانو یوسف کے خیال میں محو چارپائی پر دراز چھت کی کڑیاں گن رہی تھی۔ پسینے کے قطرے اس کے ماتھے پر افشاں کی طرح چمک رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شیربانو کا دل دھڑکنے لگا، وہ بے اختیار دروازے کی طرف لپکی، دروازہ کھولا تو ایک بھولی بھالی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے خدوخال میں یوسف کے نقوش جھلک رہے تھے۔

"کیا بات ہے بہن۔ تم کون ہو۔ آؤ بیٹھو"۔ شیربانو نے نووارد لڑکی کا بڑے پیار سے استقبال کیا۔

"پیاسی ہوں بہن، پانی پلا دو"۔ خشک دہن لڑکی نے بڑی منت سے کہا اور شیربانو دوڑ کر لسی کا بھرا ہوا پیالہ لے آئی۔ لڑکی کا حلق تر ہوا تو گویا زندگی اس کے چہرے پر نکھر آئی۔ اس نے ممنون آنکھوں سے شیربانو کی طرف دیکھا اور

رخصت چاہی۔ شیر بانو نے اسے بہ اصرار بٹھا لیا۔ اس نے اس لڑکی سے یوسف کی خوشبو سونگھی تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا۔ کہ اس کو یوسف کے ساتھ ضرور کچھ نسبت ہے "بہن کہاں سے آرہی ہو۔ اتنی نڈھال کیوں ہو؟" شیر بانو نے کریدتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

" مجھے بندی کہتے ہیں۔ میرا بھائی یوسف ہر روز شکار کھیلنے کڑہ مار جاتا ہے۔ میں اسے دوپہر کا کھانا پہنچانے جایا کرتی ہوں، ابھی ابھی اُدھر ہی سے آرہی ہوں۔ پیاسی تھی۔ مجبوراً تمہارا دروازہ کھٹکھٹایا۔"

"کون یوسف۔ ترلاندی والے حسین کاکا کا بیٹا؟" یہ کہتے ہوئے شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔

"ہاں بہن وہی" بندیٔ نے جواب دیا اور شیر بانو کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے "بندیٔ بہن۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تھوڑا سستا لو۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے چلی جانا۔ اور ہاں یوسف خاں کو جب بھی کھانا دے کر لوٹو۔ یہاں گھڑی دو گھڑی دم لے لیا کرو۔ خوش قسمت ہو بندیٔ بہن جو یوسف جیسا بھائی رکھتی ہو۔" اور باتوں ہی باتوں میں شیر بانو نے بندیٔ سے یوسف کے متعلق بہت کچھ پوچھ لیا۔

شیر بانو بڑی خوش تھی، اس نے گھر بیٹھے محبوب پا لیا تھا۔ بندیٔ ہر دوپہر کو آتی اور شیر بانو اس سے یوسف کے متعلق ہی پوچھتی رہتی۔ جب یوسف کا ذکر ہوتا تو شیر بانو مسکراتی، اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ ذکرِ حبیب سے اس کے چہرے پر بہار کھل جاتی۔

بندیٔ کی زبانی جب پہلے پہل یوسف نے شیر بانو کی محبت اور اس

کی والہانہ پرستش کا قصّہ سُنا۔ تو اس کے دل میں بھی میٹھی میٹھی گدگدی ہونے لگی۔ اسے پہلی بار اپنے روزمرّہ کے اشغال میں کوئی داخل ہوتا محسوس ہوا۔ دوسرے دن جب شکار سے واپسی پر یوسف نے کی بے چین نگاہوں نے گاؤں کے ذرّے ذرّے کا جائزہ لیا تو یکبارگی اس کی نظر ایک موڑ پر جا کر رک گئی۔ پرشوق آنکھوں نے اس کا استقبال کیا۔ ہنستے ہوئے چہرے نے اسے خوش آمدید کہی اور اس کی بازجیسی چمکتی اور کٹیلی نگاہوں کی پذیرائی نرگسی نے اپنے دل و جگر سے کی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت کے پیغام دیئے۔ عہد و پیمان کی گرہیں پڑیں۔ یہ میٹھی میٹھی آنچ دونوں طرف سلگنے لگی۔ محبت کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ بڑھتی گئیں۔ اب یوسف صرف شکاری ہی نہیں، شکار بھی تھا۔

ایک صبح حسبِ معمول یوسف، کرّہ مار شکار کو گیا۔ سکندر آباد میں دو بے چین نگاہوں نے سرِ راہے ایک دوسرے کا سلام لیا۔

یوسف کرّہ مار پہنچ کر اپنے روزمرّہ کے مشاغل میں مگن ہو گیا۔ وہ بظاہر شکار میں مصروف، کرّہ مار کی چٹانوں اور جھاڑیوں میں تگ و دو تھا۔ لیکن اس کا دل محبوب کے خیال میں محو تھا۔ گویا وہ چٹانوں، پتھروں اور کنگروں کے آس پاس شیربانو کو تلاش کر رہا تھا۔ ہر پتھر پر اس فرہاد کو اپنی شیریں کی تصویر نظر آتی اور ایک لمحے کے لئے تو وہ اسے سچ مچ شیربانو ہی سمجھ لیتا۔ اس کی طرف لپکتا۔ لیکن فوراً ہی اسے احساس ہوتا کہ یہ خیال کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی اُدھیڑبن میں اس کا پاؤں ایک چٹان سے پھسلا اور کرّہ مار کے آسمان بوس کنگر سے وہ ایک ایسی کھائی کی طرف تیزی سے گرنے لگا۔ جس کی تہ میں موت اس کے لئے منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس نے بہتیرے

ہاتھ پاؤں مارے لیکن فضا میں کوئی چیز بھی اسے گرنے سے نہ روک سکی۔ آخر پتھروں کے سینے کو چیرتے ہوئے ایک درخت نے اُسے سہارا دے ہی دیا۔ اس نے بڑی مستعدی سے اس کی شاخ کو پکڑ لیا۔ وہ ہوا میں معلق تھا۔ چھوڑے تو موت نہ چھوڑے تو کب تک لٹکا رہے۔

مشرق کا کیمیا گر، مغرب کے دامن میں بیٹھا سونا بنانے لگا۔ اُفق کے کنارے طلائی ہو گئے۔ اور در و دیوار پر گندھک ایسے سائے پھیل گئے۔ تو شیر بانو یوسف کے انتظار میں زلیخا کی طرح چشم براہ ہو گئی۔ آج وقت جا رہا تھا۔ لیکن یوسف کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اتنے میں دور گھنگھروؤں کی آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولنا شروع کر دیا۔ اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ یوسف آ گیا لیکن یوسف کہاں تھا؟ البتہ اس کے کتے بڑی پریشان حالت میں گاؤں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ آج ان کی آواز میں فریاد تھی۔ شیر بانو کا دل دھڑکنے لگا۔

یا اللہ میرے یوسف کی خیر ہو!" اندھیرا چاروں طرف مسلط ہو گیا۔ شیر بانو نے رات جیسے انگاروں پر لوٹتے کاٹی —— تمام رات یوسف کے کتوں کی بھیانک آوازیں آتی رہیں۔ شیر بانو سمجھ گئی۔ کہ یوسف پر ضرور کوئی اُفتاد پڑی ہے۔

صبح کے سفید و براق پرندے نے ابھی اپنے اُجلے پروں کو پوری طرح کھولا بھی نہ تھا —— فضا ابھی ملگجی ہی تھی کہ شیر بانو کے کان میں پھر کتوں کی آواز آئی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کوٹھے پر آئی۔ کتوں کے پیچھے پیچھے بندئی اور اس کی ماں ہانپتی کانپتی جا رہی تھیں۔ شیر بانو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

اس کی رگ رگ میں الاؤ دہک رہے تھے، وہ بھی ان کے پیچھے ہولی۔
یوسف کو کنوئیں میں لٹکتا دیکھ کر ماں نے سینہ پیٹ لیا، بہن نے سر کے بال نوچ لئے اور شیر بانو تو جیسے بے روح ہو رہی تھی۔ یوسف لٹک رہا تھا۔ اس کی زندگی اور موت کے درمیان درخت کی صرف ایک شاخ حائل تھی۔ اگر یہ درخت بھی نہ ہوتا! شیر بانو نے سوچا "تو میرا یوسف، موت کے بھیڑیئے کے چنگل میں ہوتا، اور موت کا بھیڑیا کسی پر رحم نہیں کرتا" اس خیال کے آتے ہی جیسے اس کے بدن سے کسی نے خون نچوڑ لیا۔ اس کا انار جیسا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ یوسف نے ماں سے گلہ کیا "ماں تمہاری ممتا کو کیا ہو گیا تھا۔ اسے میری تکلیف کا احساس کیوں نہ ہوا؟"
"بیٹے میں نے تمام رات آنکھوں میں گذاری" ماں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔
"اچھا تو بتاؤ ماں رات کتنی دفعہ بادل گھر کر آئے؟" لیکن یوسف کو ماں کے جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ اس نے دوبارہ سوال کیا۔ لیکن اسے ماں کے جواب میں حقیقت کا سونا دمکتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ اس کی ناکام آنکھوں نے اپنی معصوم بہن سے پوچھا۔ اور جب وہاں سے بھی اسے مایوسی ہوئی۔ تو اس کی مایوس آنکھیں شیر بانو سے چار ہوئیں۔ جہاں خلوص اور محبت کے علاوہ شب فراق کی داستان کے بے شمار افسانے بھی تھے۔ اس کے آنسوؤں میں ہجر و فراق کی کلفتوں اور صعوبتوں کے دریا بند تھے۔ اس کی ڈھارس بندھ گئی۔ شیر بانو کے مرمریں ہاتھوں نے اپنے سر کی چادر یوسف کی طرف پھینکی۔ ماں کی ممتا، بہن کے خلوص اور عشق و محبت کی کشش نے مل کر یوسف کو نئی زندگی عطا کی۔
محبت ذرے سے آفتاب اور قطرے سے سمندر بن چکی تھی۔ آخر وہ گھڑی

آئی جب کہ یوسف کی ماں شیر بانو کا رشتہ مانگنے گئی۔ ترلاندی کے بڑے ملک حسین کا کاکے شمشاد قد بیٹے اور اکلوتے وارث یوسف کے رشتے کو بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ شیر بانو بھی اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ والدین نے سوچا جوڑا موزوں ہے لیکن تقدیر کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اُسے دونوں کا خلوص و محبت ابھی گوارا نہ تھا۔ شیر بانو کے چچیرے بھائی اس رشتے کے مخالف تھے۔ وہ تو شیر بانو پہ خود قبضے کی سوچ رہتے تھے۔ اُنہوں نے چچا سے کہا: شیر بانو یوسف زئیوں کی ناک ہے۔ اور قبیلے کی ننگ و ناموس، یہ ہمارے قبیلے کی تمام عورتوں کے سر کا قیمتی دوپٹہ ہے۔ جسے ہم معمولی قیمت پر نہیں دیں گے۔ اور قبیلے کی رسم کے مطابق شیر بانو کی قیمت طلب کی گئی تو وہ یوسف کے مال و ملک سے کہیں زیادہ تھی۔

عشق و محبت کے سودے سے بے خبر لوگوں کی ذہنیت پر یوسف اور شیر بانو کو غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی، لیکن صدیوں کی قومی روایات اور قبیلے کی مقدس رسوم کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہی بنی حُسن و عشق کے درمیان قبیلے والوں نے سونے کی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ پیار بھرے دو دلوں میں مال و زر کی ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی تھی جسے مال و زر ہی پاٹ سکتے تھے۔ اس خلیج کو پاٹنے کے لیئے یوسف کو کمر ہمت باندھنا پڑی۔ وہ ماں کی کوکھ کو جلتا، بہن کی محبت کو سلگتا اور شیر بانو کی امنگوں کو سسکتا ہوا چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔

اکبر اعظم کی فوج دریا موج میں یوسف نے تھوڑے ہی دنوں میں بڑا نام پیدا کر لیا۔ اُسے سپاہی سے افسر بنتے دیر نہ لگی۔ چند دنوں میں اُس نے ترقی کر لی۔ یوسف کی ماں اور بہن ناز و نعم کی پلی بہن اس کے چلے جانے پر بے کسی کی زندگی

گذارنے لگی۔ ترپوروں نے شکر کیا کہ یوسف چلا گیا۔ وُہ سمجھے اب وہ واپس کہاں آئے گا۔ چند دنوں بعد اُنہوں نے مشہور کر دیا کہ یوسف مارا گیا۔ اور اس طرح ساری جائداد پر خود قبضہ کر کے ماں بیٹی کو گھر سے نکال دیا۔ شہزادیوں کی طرح زندگی بسر کرنے والی ماں اور بیٹی لوگوں کی خدمت کر کے زندگی کے دن گذارنے لگیں۔

شیر بانو زخمی کوئل کی طرح ہجر و فراق کے لمحات تڑپ تڑپ کر گزارنے لگی اور جب اس کا باپ مر گیا تو اس کے رہے سہے حواس بھی کھو گئے۔ اب تو اس کا وسیع و عریض گاؤں، اس کے ہرے بھرے کھیت اس کے لئے قفس کی طرح تھے۔ اب وہ اپنے چچازاد بھائیوں کے ظلم و جور کا شکار تھی۔ شیر بانو کے کان میں یہ بھنک پڑی۔ کہ اس کے چچازاد بھائیوں کی نیت میں فتور ہے۔ وہ اسے پر کٹے پرندے کی طرح ذبح کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس پر ہر ممکن ظلم کرینگے۔ یہاں تک کہ —— اُس کی شادی بھی کسی اور کے ساتھ کر دیں گے۔ وہ کانپ اٹھی اور اپنے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ اگر اس کا ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ میں دیا گیا تو وہ زہر کھالے گی۔

اور پھر —— وُہ منحوس گھڑی بہت جلد آگئی جس میں ڈھول سُرنا نے شیر بانو کی شادی کا اعلان کر دیا۔ شیر بانو پر غم والم کا آسمان ٹوٹ پڑا۔ اس نے کسی طرح بندی کو بلوا بھیجا —— "بندی بہن اس بھری دنیا میں میرا تیرے سوا کوئی نہیں۔ بہن اگر تو مجھے تھوڑا سا زہر لا دے تو بڑا احسان ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ یوسف کے علاوہ کسی اور کے گھر جاؤں۔ وہ کہے گا شیر بانو بے وفا نکلی۔ یہ لے میرا سونے کا پیزوان اسے بیچ ڈال تاکہ میری پاک محبت پر حرف نہ آئے۔ بہن جلدی اثر کرنے والا زہر لانا۔"

"شیر بانو بہن، تو نے میری مشکل بھی حل کر دی۔ زہر میں مجھے بھی شریک کرنا۔ اب تو میں بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ میرا شہزادہ بھائی یوسف نہیں ہے، تو میں جی کر کیا کروں گی"۔ اور بندی دوسرے دن زہر لانے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

نقارے بج رہے تھے، ڈھول سرنا کی چھنجھم دھاڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک طرف چولہوں پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور بندی بدقسمت بندی ان دیگوں کے لئے پانی ڈھو رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور لب پر یوسف کا نام۔ وہ بھائی سے شکایت کر رہی تھی کہ وہ ایسا گیا کہ اپنی بہن کی خبر تک نہ لی ـــ اسی محویت میں ایک گھڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔ گھڑا ٹوٹ گیا باورچی نے اس حرکت پر اسے گھڑکا۔ اس کا پیمانۂ صبر لبریز تو تھا ہی، بے اختیار چھلک پڑا۔ وہ ایک طرف جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ـــ "اے بھائی، اے میرے یوسف بھائی! اے گاؤں کے سردار بھائی، آ دیکھ تیری ناز و نعم کی پلی بہن کو کیا کیا دکھ جھیلنے پڑ رہے ہیں"۔ میلے کچیلے دوپٹے کی سلوٹوں میں اس کے آنسو جذب ہو گئے۔ بے حس دوپٹہ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت کیا جانے۔!

"بندی بہن!" کسی نے اُسے پکارا اور اسے فوراً شیر بانو کا وعدہ یاد آیا۔ "زہر" اس خیال نے جیسے اُس کے سینے سے ایک بھاری پتھر ہٹا دیا۔ اب اسے ان مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھی: "بندی بہن، رو کیوں رہی ہو؟ میں آ گیا ہوں۔" جب بندی نے یوسف کو اپنے سامنے کھڑا پایا، تو چیخ مار کر بھائی کے ساتھ لپٹ گئی، خوشی کے اس عالم میں وہ کبھی ہنستی کبھی روتی۔

"یہ سب کیا ہے بندو؟" یوسف نے دیگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

ہو تمہاری بہن اب حسین کا کا کی بیٹی نہیں ، ایک خدمت گار ہے ۔ میرے یوسف بھائی ! یہ سب شیر بانو کی برات کا سامان ہے اور میں یہاں مزدوری کر رہی ہوں"۔

" فکر نہ کرو بہن ، یوسف اب صرف شکاری یوسف نہیں رہا ، بلکہ وہ وقت کے بہت بڑے حاکم اکبر اعظم کی فوج کا ایک اعلیٰ افسر بھی ہے ۔ میں چھٹی لے کر آیا ہوں ۔ میرے ساتھ میرے سپاہی بھی ہیں ۔ تم جا کر شیر بانو کو خوش خبری سنا دو ۔ کہ یوسف ہندوستان سے اپنے ساتھ بہت سی دولت لے کر آ گیا ہے ۔ اور برات کے چاول اسی کے براتی کھائیں گے ، اور پھر ۔۔۔ عین وقت پر جب قاضی صاحب نکاح پڑھنے ہی والے تھے ۔ یوسف نے اپنے مسلح سپاہیوں سمیت حملہ کر دیا ۔ برات میں بھگدڑ مچ گئی ۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو گیا ۔ اور پھر یوسف کو فوج کے ساتھ دیکھ کر لوگ سوچ میں پڑ گئے کہ یہ سب خواب ہے یا بیداری ۔

دشمنوں میں سے جس جس نے مقابلے کی کوشش کی اُسے تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ یوسف بھی سارے گاؤں کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتا تھا ۔ اُس نے اپنے حریفوں سے ہی انتقام لیا ۔ اور جب میدان صاف ہو گیا ۔ تو وہ خلوص و محبت بھرا دل لے کر شیر بانو کے حضور آ پہنچا ۔ ایک لمحہ تو دونوں ایک دوسرے کو اس طرح خاموش دیکھتے رہے جس طرح دو تصویریں آمنے سامنے رکھ دی گئی ہوں اور جب مہر سکوت ٹوٹی تو دونوں کی آنکھوں کی سیپیوں میں محبت کے موتی بھر گئے ، گلوں شکووں کے دفتر کھل گئے ۔

گاؤں والوں نے مل کر اپنے بہت بڑے سردار حسین ملک کے بیٹے یوسف کو خوش آمدید کہی ۔ انہیں خوشی ہوئی کہ حسین ملک کا نام زندہ رکھنے والا زندہ ہے ۔

شیر بانو کو حیتن ملک کی بہو بنا کر لایا گیا اور بندی نے ایک اچھی نند کی طرح اس کا استقبال کیا۔ یوسف نے اپنے گاؤں سے پرے الگ ایک دنیا بسائی۔ کرہ مار پہاڑ کی چوٹی پر اپنی شکار گاہ میں۔ جہاں اسے شیر بانو کے دو چیتے نے موت کی بھیانک کھائی میں سے نکالا تھا۔ یوسف کو الگ تھلگ دنیا پسند تھی۔ وہ اسی دنیا میں شکار بھی کھیلتا اور اپنی محبوبہ کے ساتھ راز و نیاز بھی کرتا۔

ایک دن اچانک بندی بیمار ہو گئی۔ یوسف کو بہن بڑی عزیز تھی، اس نے دنیا جہان کے طبیبوں سے علاج کروایا، گنڈے تعویذ کئے، لیکن بندی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اُن کا ایک عزیز ساتھی زندگی کے طولانی سفر میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا، لیکن یوسف کی دنیا آباد تھی۔ شیر بانو اس کی سب کچھ تھی۔

ایک دن شیر بانو کو بخار آ گیا۔ یوسف کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ اس کو چاروں طرف بھیانک کھائیاں منہ کھولے ڈرانے لگیں۔ اُس نے اپنے آپ کو درخت سے معلق پایا اور پھر یوسف سچ مچ دیوانہ ہو گیا۔ جب شیر بانو کی جوانی نے اس کے آغوش میں دم توڑ دیا!

کرہ مار کی شکار گاہ سونی ہو گئی، چہل پہل کو کسی کی نظر کھا گئی۔ اب یوسف بے خود پڑا رہتا۔ اس نے دُنیا تج دی تھی، وہ ایک دیوانہ تھا، مجذوب تھا۔ شیر بانو کی قبر کا مجذوب مجاور، دیوانہ جاروب کش، اس کی زبان پر شیر بانو کے گیت اور ٹپے تھے اور انہی ٹپوں کی ایک اونچی الاپ کے ساتھ ایک دن اس کی روح کا طائر جسم کے پنجرے کو توڑ کر نکل گیا!

کرہ مار کی چوٹی، اس کا ہر نشیب و فراز، اس کا پتہ پتہ اور بوٹا بوٹا محبت

کے ان محبتوں کی زندہ یادگار ہے۔ اس دنیا میں دو قبریں، سکندر آباد کی شہزادی شیر بانو اور ترلاآندی کے شہزادے یوسف کے خاکستری مُجلے، ان کی آخری آرام گاہیں ہیں۔ ان میں محبت کے خزانے مخفی ہیں۔ اس جگہ کو نہ تو سکندر آباد کہا جاتا ہے اور نہ ترلاآندی۔ یہ مقام اب یوسف کڑہ مار کی زلیخا شیر بانو کی نسبت سے "شیر غونڈہ" کے نام سے مشہور ہے ؂

تور دلئی و شہی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان میں مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا طوطی بول رہا تھا۔ سارے برعظیم میں اس کا سکہ رواں تھا۔ مغل پھریرا ہمالہ کی سب سے اونچی چوٹی پر لہرا رہا تھا اور ہر طرف مغل، آرٹ، قوت اور تلوار کے چرچے تھے۔

انہیں دنوں اٹک کے اس پار پشتونوں کے دو مشہور قبیلوں یوسف زئی اور مندڑیں میں باہمی رقابت چل رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔

یوسف زئی قبیلے میں دو چچیرے بھائی تور دلئی اور منور کی آپس میں بڑی محبت تھی۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ سارے قبیلے میں ان کا اتحاد ضرب المثل بن گیا تھا ——— چچیرے بھائیوں میں اتنی دوستی، تربوروں میں ایسا اتفاق —— لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور جلد ہی ان کی دوستی دشمنی میں بدلنے لگی۔ جیسے ان کی محبت کو زمانے کی نظر کھا گئی ——— والدین کی وفات کے بعد زمین کی تقسیم نے ان کے خلوص کو کچلا دیا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات ابھر آئے۔

تور دلئی کو شکار سے بڑی رغبت تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں جنگلوں اور پہاڑوں میں گزرتا۔ اسکی طبیعت میں آوارگی تھی۔ گاؤں

میں اس کا جی نہ لگتا۔

ایک دن جب وہ شکار کی تلاش میں تھے اچانک ان کے راستے میں ایک ایسی چراگاہ آگئی جو منڈرر قبیلے کی ملکیت تھی۔ تور دلئی کے لئے اسے عبور کرنا ناگزیر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے چراگاہ میں داخل ہونے پر لوٹ جانے کو ترجیح دی۔ انہیں معلوم تھا کہ منڈروں کی چراگاہ میں قدم رکھنے کا مطلب قبیلے کو جنگ کی دعوت دینا ہے۔ لیکن تور دلئی نے ساتھیوں کے مشورے پر عمل نہ کیا اور کہا "دیکھا جائیگا"۔۔۔۔

جب منڈروں کو ان کے چرواہے نے یہ خبر دی کہ یوسف زئیوں نے ہماری چراگاہ پر حملہ بول دیا ہے تو ان کی تلواریں نیام سے تڑپ کر باہر آگئیں۔ قبیلے میں جنگ کا نقارا بج گیا۔ بچہ بچہ مسلح ہو کر چراگاہ کی طرف لپکا۔ عورتوں نے گھر کا کام کاج چھوڑ کر پانی کے مشکیزے کندھوں پر ڈال لئے ۔۔۔۔ "یوسف زئیوں کی یہ جرأت کہ منڈروں کے منہ آئیں۔ انہیں مزہ چکھا دیا جائیگا۔"

منڈروں کی چراگاہ آن کی آن میں انسانوں کے خون کی جھیل بن گئی۔ تور دلئی کے چند ساتھی آخر کب تک مقابلہ کرتے۔ منڈروں کے لاؤ لشکر نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔۔۔ تور دلئی زخموں سے چور ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے اسکی زبان پر کانٹے پڑ چکے تھے۔ دشمنوں کے ہجوم میں وہ کس سے پانی مانگتا وہ تو اس کے خون کے پیاسے تھے ۔۔۔ اتنے میں ایک عورت کندھے پر مشکیزہ ڈالے اس کے قریب سے گزری۔ تور دلئی کے منہ سے بے اختیار نکلا "پانی" ۔۔۔ اور جب عورت نے اسے پانی کا مشکیزہ دیا تو اس حسین و جمیل دوشیزہ سے آنکھیں چار ہوتے ہی تور دلئی کے ہاتھوں سے مشکیزہ گر کر زمین پر آرہا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور نظریں دوشیزہ کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"کیا بات ہے اجنبی ۔۔۔ تمہارے ہاتھوں میں شمشیر و تماشہ کی قوت نہیں۔ تو تلوار کیسے چلاؤ گے۔ یوسف زئی ہونا" دوشیزہ نے طنز کا ایک نشتر چبھوتے ہوئے تور دلی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں خاتون" ۔۔۔ تور دلی نے چونک کر کہا۔

"یہ لو اور پانی ۔۔۔ میری طرف دیکھنے سے بہتر ہے کہ تم پانی پی لو۔ مندڑ اپنے دشمن کو پیاسا نہیں دیکھ سکتے۔

"پانی تو پی چکا ہوں لیکن پیاس اتنی بڑھ گئی ہے کہ اب اسے دریا بھی نہیں بجھا سکتا۔"

"اگرچہ مجھے یوسف زئی کے نام سے نفرت ہے لیکن میں اس دشمن کی بھی قدر کرتی ہوں جس کی پیٹھ پر زخم نہ ہو اسی لئے میں نے تجھے بہادر جان کر پانی دیا لیکن تیری باتوں سے تو بزدلی کی بو آرہی ہے۔"

"میں یوسف زئی قبیلے کا شیر دل جوان ہوں اپنے قبیلے کی آن پر کٹ مرنے والا ۔۔۔ میں مندڑوں کے ان گیدڑوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جنہوں نے جھاڑیوں میں چھپ کر ہم پر حملہ کیا ۔۔۔ میرے تیر میں ہزاروں مندڑوں کے سینے چھلنی کرنے کی قوت ہے۔ لیکن آج میں تیری پلکوں کے تیروں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔"

"نوجوان ہوش میں آؤ۔ یہ جنگ کا میدان ہے اس میں تلوار چلتی ہے۔ گیت نہیں گائے جاتے۔ اگر گیت ہی گانے ہوں تو اپنے حجرے میں بیٹھ کر گاتا ۔۔۔"

"جنگ اور محبت دونوں نے ایک دوسرے کو جنم دیا ہے۔ میری آنکھوں میں تیرے لئے محبت کی چنگاریاں آباد ہیں۔ کیا میں تمہارا نام دریافت کر سکتا ہوں۔"

میرا نام تہمی ہے۔ تم کتنے بے خبر ہو نوجوان ـــــ مجھے نہیں جانتے میں منڈوں کے سردار مستجاب خان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔"

جب لڑائی ختم ہوگئی تو یوسف زئی قبیلے کے سرداروں نے جرگہ بلایا تاکہ جنگ کے اسباب معلوم کئے جائیں اور پتہ لگایا جائے کہ یوسف زئیوں کے جو جوان اس حادثے میں کام آئے ہیں اسکی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ـــــ

منور نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر اس لڑائی کا ذمہ دار توردلئی کو ٹھہرایا ـــــ جرگے نے فیصلہ دیا کہ توردلئی کی وجہ سے قبیلے کو جو نقصان پہنچا ہے۔ اسکی پاداش میں اسے گاؤں سے نکال دیا جائے۔

توردلئی اپنے گاؤں کے نوجوانوں کا سردار تھا وہ حجرے کی زینت تھا۔ اس نے گاؤں چھوڑا تو یوسف زئی قبیلے کے جوانوں کا ایک خاصا گروہ اس کے ساتھ ہولیا۔ اور یہ سب کے سب پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے لگے ـــــ توردلئی کو جرگے کے اس نامنصفانہ فیصلے پر بڑا دکھ ہوا۔ اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ منور نے کرایا ہے۔ تو آتش انتقام کے شعلے اس کے رویئں رویئں سے نکلنے لگے۔ اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب وہ امن کی زندگی ترک کرکے ڈاکو بنے گا ـــــ جب جرگہ بے انصافی پر اتر آئے۔ جب بڑے بوڑھے حق تلفی کرنے لگیں تو کیوں نہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے ـــــ اب توردلئی بہت بڑا ڈاکو بن چکا تھا۔ اس تصور نے منور کی زندگی تلخ کردی۔ اسے توردلئی کے انتقام سے خوف محسوس ہونے لگا۔

ایک عرصہ تک توردلئی اسی دھن میں مگن رہا۔ وہ ڈاکے ڈالتا۔ قتل و غارت کرتا۔ اس کے ضمیر نے اسے کبھی ملامت نہ کیا۔ وہ دن دھاڑے لوٹ مار کرتا۔ اور اپنے

غاروں میں ساتھیوں کے ساتھ جشن مناتا لیکن اس عرصے میں اس کے دل میں جو چیز کانٹا بن کر کھٹکتی رہی وہ شہتی کی یاد تھی۔ یہ خلش اسے ہر وقت ستاتی۔ شہتی کو اپنانے کی اسے کوئی صورت نظر نہ آتی —— اس نے چاہا کہ وہ اسے اغوا کر لائے۔ لیکن اس نے اپنے بازوؤں میں وہ قوت نہ پائی جس سے منڈروں کا مقابلہ کر سکے۔ اور جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ضبط کا یارانہ رہا تو ایک دن خود بخود مستجاب خان کے حجرے میں جا داخل ہوا۔ اسے مہمان سمجھ کر خوش آمدید کہی گئی۔ خان نے اسے چارپائی پر اپنے برابر جگہ دی اور نوکر سے کہا مہمان کے لئے تکیہ لاؤ اور لسی کا ایک کٹورا بھی ——

"مہمان تم کہاں سے آئے ہو اور کون ہو کیا چاہتے ہو؟ ہم تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔"

"میں صرف آپ کے سلام کے لئے آیا ہوں مجھے تور دلی کہتے ہیں!"

"تور دلی" —— مستجاب خان ایک دم چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے نکال لی —— "ڈاکو —— چور —— خونی —— بتاؤ کس نیت سے یہاں آئے ہو۔ اگر تم میرے حجرے میں نہ ہوتے تو تمہیں میری تلوار سے دنیا کی کوئی طاقت نہ بچا سکتی!"

"میں ڈاکو ہوں ملک بابا! لیکن یہاں ڈاکو کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مظلوم فریادی بنکر آیا ہوں۔"

مستجاب خان کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ تلوار نیام میں چلی گئی وہ مطمئن ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"ہاں کہو —— کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہم مظلوم کی ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہیں۔

چاہے وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو ۔۔۔"

"خان بابا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ ڈاکہ زنی میرا پیشہ نہیں۔ مجھے حالات نے ایسا بننے پر مجبور کیا۔ منور نے جرگے والوں کو ورغلا کر مجھے گاؤں سے نکلوا دیا۔ میری زمین پر خود قابض ہو گیا اور مجھے ڈاکو بننے پر مجبور ہونا پڑا۔"

"اگر تم ٹھیک کہتے ہو پھر تو تم پر واقعی بہت ظلم ہوا ہے۔ میں تو آج تک اندھیرے میں تھا۔ مجھے تو کچھ اور ہی کہا جاتا رہا۔ نوردلی مجھے تم سے ہمدردی ہے اور میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"خان بابا۔ میرا آپ کے سوا کوئی بھی نہیں رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اگر آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کر لیں تو میں عمر بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

"(خان چونک کر) ۔۔۔ ہوش کی دوا کرو نوردلی ۔۔۔ یوسف زئی اور منڈر کا رشتہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں قبیلے کا سردار ہو کر ایسی حرکت کروں تو جرگے کو کیا جواب دوں گا۔"

"لیکن خان بابا میں تو آپ ہی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی دولت آپ ہی کے گھر رہے گی۔"

یہ سن کر مستجاب خان ایک گہری سوچ میں غرق ہو گیا۔ ایک طرف نوجوان بہادر نوردلی تھا۔ جس سے بہتر رشتہ اسے یقیناً اپنی اکلوتی بیٹی شہی کے لیے نہیں مل سکتا تھا۔ دوسری طرف قبیلے کی عزت، جرگے کا خوف، عداوت اور پختو ایسی چیزیں تھیں۔ جن کی وجہ سے یہ رشتہ ہونا ناممکن سی بات تھی ۔۔۔ اور جب ملازم لسی کا کٹورہ لے کر آیا۔ تو مستجاب خان نے چونک کر کہا ۔۔۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے تور دلی [illegible] تو [illegible] پوری کرونگا۔ خواہ اس کے [illegible] [illegible]"

توردلی نے اٹھ کر مستجاب خان کے [illegible] اور [illegible] کے لیے توبہ کر کے خان کے پاس رہنے لگا۔ وہ خوش تھا [illegible] برآئی۔ اپنی محبوبہ کے انگارہ سے رخسار اور پھول جیسے تبسم گیسوؤں کے ٹھنڈے سائے پا کر وہ زمانے کے [illegible] کو بھول چکا تھا۔

منور کو اس بات کا علم ہوا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس نے سوچا توردلی کا مستجاب خان کی لڑکی سے رشتہ طے پا گیا تو وہ بڑی طاقت پکڑ جائے گا اور اس کے لیے مستقل خطرہ بن جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ابھی اور اسی وقت اس کا سر کچل دیا جائے۔ چنانچہ وہ موقع کی تلاش میں رہا اور ایک دن جنگل میں [illegible] اپنے ساتھیوں سمیت جا کر اسے گھیر لیا۔ اکیلا توردلی کب تک کا مقابلہ کرتا۔ قریب تھا کہ منور کی تلوار اسکی زندگی کا خاتمہ کر دے کہ اتنے میں مستجاب خان [illegible] آدمیوں سمیت آ پہنچا۔ اور ایک خونریز لڑائی کے بعد منور کو بھاگنا پڑا۔

شیریں۔ توردلی کی محبت کا زخم میدان جنگ سے لے کر آئی تھی۔ [illegible] اب تک ایک مقدس امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ توردلی کو [illegible] تھی۔ وہ جب بھی اسے دیکھتی اس کے جذبات میں [illegible] کیفیت پیدا ہو جاتی اس کی نس نس [illegible] کی طرح [illegible] اس کا [illegible] [illegible] [illegible] محبت کے باوجود [illegible] [illegible] وہ [illegible] توردلی [illegible] [illegible]

کانپ جاتا اور اسے تور دلئی سے نفرت ہونے لگتی۔ پھر وہ یوسف زئی بھی تھا۔ ان کے قبیلے کا ازلی وابدی دشمن ——— جنہیں کوئی منڈر کبھی بھی بغیر گالی کے یاد نہ کرتا۔ وہ سوچتی کہ اس کی شادی ہوگئی تو قبیلے کی عورتیں اس پر آوازے کسیں گی۔ اس پر انگلیاں اٹھائیں گی۔ اور اس کا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ کہاں یوسف زئی ڈاکو اور کہاں منڈروں کی شہزادی ——— سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا۔ وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان سے بیزار نظر آنے لگی ———

آخر ایک دن اس نے فیصلہ کن انداز میں ماں سے کہا ——— "ماں میں تور دلئی سے شادی نہیں کرونگی"۔ ماں نے اُٹھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بدتمیز لڑکی تمہیں شرم نہیں آتی۔ یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہے"

"ماں وہ چور ہے، ڈاکو ہے، خونی ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ یوسف زئی ہے۔ ہمارے قبیلے کا دشمن ——— ماں ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے"۔

"خاموش ——— اپنے منگیتر کے خلاف زبان کھولتے تجھے حیا نہیں آتی۔ کیا اپنے باپ کے شملے کو خاک میں ملانا چاہتی ہے۔ خبردار جو آئندہ تیرے منہ سے کبھی ویسی بات نکلی ——— کہیں باپ نے سن پایا تو تیری زبان کھینچ دے گا ——— متجاب خان کی زبان سے نکلی ہوئی بات ہر قیمت پر پوری ہو کر رہتی ہے۔ تور دلئی یوسف زئی سہی لیکن اب وہ ہمارا ہو چکا ہے۔ اور پھر منڈروں اور یوسف زئیوں میں ایسا فرق ہی کیا ہے دونوں چچا زاد بھائی ہی تو ہیں۔ یہ تو بزرگوں کا بُرا ہو جنہوں نے انہیں ایک دوسرے کا دشمن بنا رکھا ہے ——— بیٹی وہ ڈاکو نہیں اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ اس کی جائیداد ہے۔ زمین ہے، خاندان ہے۔ اپنے پرائے ہیں یہ تو دشمنوں نے اسے کہیں سے

کہیں پہنچا دیا تھا اور سب تم دیکھتی ہو۔ وہ سب بڑے کام چھوڑ کر کونا بنک بن چکا ہے"

نور دلئی جو دروازے کی اوٹ سے یہ تیز گفتگو سن رہا تھا۔ یکایک اندر آگیا اور کہنے لگا۔ "ہنسی ــــ یہ ڈاکو نہیں ہیں۔ یہ جس دن سے مستجاب خان کے گھر میں قدم رکھا ہے اسی دن سے سب بڑے کام چھوڑ دیے ہیں۔ ہم نے تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اپنا خاندان اور قبیلہ بھی چھوڑ دیا ہے"

ہنسی کے چہرے کو شرم و حیا کے سرخ آنچل نے ڈھانپ لیا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا اور مارے ندامت کے عرق عرق ہو گئی۔

"نور دلئی مبارک ہو تمہیں ــــ دشمن اپنی موت آپ مر گیا" مستجاب خان نے مکان میں داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے کہا ــــ

"کون دشمن بابا" ــــ نور دلئی نے حیرت سے پوچھا۔

"منور اور کون"

"وہ کیسے بابا"

"ہاشم خبر لایا ہے کہ منور نے شہنشاہ اکبر کی فوج میں نوکری کر لی ہے اور گاؤں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"خوب۔ خوب ــــ کم بخت نے کانٹے بوئے تھے۔ جو کچھ کاٹ سکتا تھا۔ مجھے اپنے گھر بار اور کھیت کھلیان سے نکالا۔ خدا نے اسے بھی پردیس کے جہنم میں دھکیلا اب پرائی چاکری کرے گا۔ در در کی ٹھوکریں کھائے گا تو قدرِ عافیت معلوم ہو گی اسے ــــ نور دلئی نے نفرت بھرے انداز میں کہا"

بیٹا اگر وہ سچ مچ گاؤں چھوڑ گیا ہے۔ تو تمہاری شادی میں کرتی ورنہ نہیں۔ میں نے

تمام انتظام مکمل کر رکھا ہے۔"

دوسرے دن منور کے بھرتی ہونے کی تصدیق ہوتے ہی تورد لئی کی شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ منڈروں کے سردار کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ ہر گھر یا مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ ہر آنگن میں "اتن ناچ" کے رومانی دائرے سبز سرخ اودے اور سرمئی آنچلوں کی قوس قزح بنا رہے تھے۔ حجروں میں منڈروں کے شمشاد قد جوان گھڑے کے ساز پر ٹپے گا رہے تھے۔ رباب کی دھنوں کی زبان سے محبت کی داستان سرائی ہو رہی تھی۔ ڈھولک، سرنا کی جوشیلی تانوں پر ملیزہ اور شاڈولا ناچ ناچا جا رہا تھا ——— غرض منڈروں کی سرزمین کے چپے چپے پر یوں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ جیسے عید کا چاند نکل آیا ہو۔

تہمی کے دل میں محبت کی دھڑکنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ جب اسے خیال آتا کہ وہ آج کل میں تورد لئی کی ہو جائے گی اور پھر وہ دونوں اپنی دنیا کے راجہ رانی ہوں گے تو اس کا چہرہ لذیذ جیسی نشیلی گرمی محسوس کرتا اور پسینے کے قطرے اس کی چاند ایسی پیشانی سے بہہ کر ستواں ناک پر آجاتے اور سونے کے چمکتے ہوئے پیزوان میں آکر موتی کی طرح اٹک جاتے۔

"کیا سوچ رہی ہو تہمی ———" تورد لئی کی آواز سے تہمی چونک کر جھینپ سی گئی اس نے جلدی سے دوپٹے کو سر پر کھینچ لیا جو ڈھلک کر اس کے شانوں پر آگرا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ بس یونہی بیٹھی ہوں ——— لیکن تم آج بڑے خوش نظر آ رہے ہو۔ بات کیا ہے۔"

"میری خوشی کا آج کیا ٹھکانہ ہے شہی ۔۔۔ ایک تو تمہارا پنی ہار مان کر بھاگ گیا۔ دوسرا مجھے میری خوابوں کی وہ ملکہ ملنے والی ہے جس نے برسوں سے میری نیند حرام کر رکھی تھی۔ شہی تم کیا جانو کہ تمہارے وصال کے تصور سے میرے دل کی کیا کیفیت ہے یہ چند گھڑیاں میرے لئے پہاڑ بن گئی ہیں۔"

"درست ہے۔ میرے لیڈر میرے محبوب تمہاری خوشی بجا ہے لیکن میں سمجھی تھی کہ تم جو اتنے زیادہ خوش ہو تو شاید میرے لئے شہنشاہ اکبر کی رانی کا ست لڑا ہار لے آئے ہو۔" شہی نے حسب عادت طنز کا ایک زہریلا تیر پھینکا۔

شہی کے اس طنز نے تور دلئی کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی رگ رگ میں سوئی ہوئی یوسف زئی غیرت اور پٹھان ایکدم جاگ اٹھی۔ اس کا دماغ ہنڈولے کی طرح گھومنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہ شہنشاہ اکبر کے محل میں کھڑا ہے سامنے تخت پر ملکہ بیٹھی ہے۔ اچانک وہ جھپٹ کر تخت پر چڑھ گیا اور ایک ہی جھٹکے میں ست لڑا ہار ملکہ کے گلے سے چھین کر لے آیا"

"تم تو سوچ میں پڑ گئے۔ خیر ہے کوئی بات نہیں۔ آج نہ سہی کل لے آنا ہار، اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" شہی شرارت آمیز چٹکی لیتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"منڈروں کی ملکہ تو واقعی ست لڑے ہار کے قابل ہے اب میں نے عزم کر لیا ہے کہ تمہاری فرمائش پوری کر کے ہی دم لوں گا۔ اگر اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تو مجھے معاف کر دینا۔ میری شہی۔ خدا حافظ ۔۔۔"

شہی جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی۔ اپنے چونچلوں کا یہ خوفناک نتیجہ دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئی ۔۔۔ "میرے سرتاج، میرے مجھے ست لڑا ہار نہیں چاہیے۔

—— واپس آجاؤ۔ خدا کے لیے واپس آجاؤ۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں وہ بے اختیار ہو کر پاگلوں کی طرح چلاّنے لگی —۔ لیکن آہ! تور دلئی جا چکا تھا۔

شہی کے حسین خوابوں کی مالا ٹوٹ گئی اور اس کا دانہ دانہ بکھر گیا۔ منڈروں کی بستی میں قہقہوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ رباب کے تار شل ہو گئے۔ گھنگھروؤں کی کھنک نے دم توڑ دیا۔ مستجاب خان کا ہنستا بولتا چہرہ اُداسیوں میں ڈوب گیا "یہ کیا کر دیا تو نے —— شہی یہ کیا کر دیا —— بیوقوف لڑکی تو نے اپنے ہاتھوں اپنا سہاگ اجاڑ دیا۔ باپ کی کمر توڑ دی۔ قبیلے کی ناک کاٹ دی —— آہ ——" مستجاب خان غش کھا کر گر پڑا اور جب اسے ہوش آیا تو اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دینے لگا۔

شہی —— ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج کی طرح اکیلی پڑی کرلا رہی تھی۔ وہ فراق کی آگ میں جھلسنے لگی۔ تور دلئی سچ مچ کا لیٹرا نکلا اس کے اطمینان کی دولت غارت کر کے چل دیا۔ اسے ایک پل بھی آرام نہیں تھا۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے تور دلئی ہی کے خیال میں مگن رہتی۔ وہ اس کے خوابوں میں بس گیا تھا۔ وہ دیکھتی کہ تور دلئی دشمن کی فوج میں گھر گیا ہے۔ اور وہ اس پر تلواروں اور تیروں کی بوچھار کر رہے ہیں۔ —— ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ تور دلئی اکبر بادشاہ کے قلعہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ چیخ مار کر جاگ اُٹھی۔ ماں نے تسلی دی: "بیٹی تور دلئی بڑا بہادر ہے۔ اسے بڑی سے بڑی فوج بھی نہیں پکڑ سکتی۔ گھبراؤ نہیں وہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔"

ایک رات جب چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آسمان سے تاریکیوں کے قافلے اتر رہے تھے۔ مندروں کی ساری بستی نیند کی آغوش میں اتر چکی تھی۔ شہی بدستور اپنے محبوب کے خیال میں کروٹیں لے لے کر رات کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ شہی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خدا خیر کرے اتنی رات گئے کون آیا ہے کہیں میرا نوردلی نہ ہو۔ وہ سوچ ہی رہی تھی۔ کہ مستجاب خان نے اٹھ کر دروازہ کھولا "بھگوان داس! اس وقت تم کہاں۔ خیر تو ہے آؤ بیٹھو دوست۔ کہو کیا بات ہے خیریت تو ہے"۔ مستجاب خان نے گھبراہٹ کے عالم میں اپنے دوست سے پوچھا جو ٹونک کے قلعے سے آیا تھا۔

"گھبراؤ نہیں خان"۔ بھگوان داس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا چہرہ تمہارے دل کا ساتھ نہیں دے رہا۔ ضرور کوئی ایسی بات کہنا چاہتا ہے جو تم چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ دوست، جلدی کہو۔ خدا کے لیے دیر نہ کرو۔ میں بری سے بری خبر سننے کو تیار ہوں۔"

"خان نوردلی کو شہنشاہ کے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔"

"وہ کیوں۔ کیا کیا تھا اس نے"

وہ شاہی محل میں نقب لگا رہا تھا۔ شہنشاہ نے اسے موت کی سزا دے دی۔"

بھگوان داس نے دھڑکتے دل اور آبدیدہ آنکھوں سے یہ بات کہی۔ شہی یہ سنتے ہی چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔ گھر میں واویلا مچ گیا —— بھگوان داس نے پوچھا۔ یہ شور کیسا ہے اور یہ چیخ کس کی تھی۔

"بدنصیب ہشی کو غش آگیا ہے ـــــ وہ تور دلئی کی منگیتر ہے۔ کاش یہ ا...
ست لڑے ار کا طعنہ نہ دیتی۔" شکستہ دل مستجاب خان نے دل تھام کر بمشکل یہ جملے ادا کئے۔

"ہشی ـــــ میری بھتیجی" ـــــ بھگوان یہ کہہ کر اُٹھا۔ وہ دوڑ کر ہشی کے پاس پہنچا۔ اور اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولا۔ "پتری گھبراؤ نہیں۔ بھگوان داس اپنی بیٹی کے لئے پہاڑ سے بھی ٹکر لے گا۔"

ہشی نے آنکھیں کھولیں۔" بھگوان کاکا مجھے تور دلئی کے پاس لے چلو!"

بیٹی تمہارا جانا ٹھیک نہیں۔ میں خود ہی سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ جب تک تمہارے تور دلئی کو تمہارے پاس پہنچا نہ دوں"

ـــــ والدین نے بھی بہتیرا سمجھایا لیکن ہشی مچل گئی کہ میں ضرور جاؤں گی اور جب صبح ہوئی تو بھگوان داس، ہشی اور مستجاب خان تینوں نے رخت سفر باندھ لیا۔ لیکن بھگوان نے مستجاب کو ساتھ جانے سے روک دیا۔ اور وہ ہشی کو لے کر روانہ ہوگیا۔

اٹک کا خونخوار دریا پار کر کے دونوں شہنشاہ اکبر کے فولادی قلعے میں پہنچے جہاں پہنچکر انہیں معلوم ہوا کہ کل تور دلئی کو زمین میں گاڑھ کر اس پر خونخوار کتے چھوڑے جائیں گے۔

"یہ سنتے ہی ہشی کا سر چکرانے لگا قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے لیکن بھگوان داس نے اسے سنبھالا دیا ـــــ " بیٹی ـــــ تمہارے سینے میں پٹھان عورت کا دِل ہے۔ ـ تم مستجاب خان کی بیٹی اور مندڑ قبیلے کی شہزادی ہو۔ تمہیں دلیری کے ساتھ ہر مصیبت کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ بدحواس ہونے سے ہم تور دلئی کی زندگی نہیں

بچا سکیں گے۔ اس کے لئے کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔"

بھگوان کے ذہن میں فوراً ایک تدبیر آئی۔ وہ شاہی کتوں کے نگہبان کے پاس پہنچا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا ــــ "اکبر اعظم کے حکم کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں ــــ بھگوان ہوش کی باتیں کرو۔" اس جواب سے بھگوان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا ــــ وہ گھر جا کر اپنی بہو کے کنگن لایا اور کتوں کے نگہبان کو پیش کر دیئے۔

اگلے دن جب تور دئی پر خونخوار کتے چھوڑے گئے۔ تو وہ بڑی تیزی سے اسکی طرف لپکے۔ لیکن قریب پہنچ کر اسے سونگھنے لگے اور سونگھ کر واپس چلے گئے۔

تماشائی حیران تھے ان کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔ یہ خبر سن کر شہنشاہ کو بھی بڑا تعجب ہوا۔ اور اس نے غصے میں آکر حکم دیا کہ شاہی فیل خانے کے مست ہاتھی سے مجرم کو کچلوا دیا جائے۔ اس نئے حکم نے بھگوان کا خون بھی خشک کر دیا۔ لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ شاہی مہاوت کے پاس پہنچا لیکن وہ نہایت سرد مہری سے پیش آیا ــــ بھگوان مغموم ہو کر گھر آیا اور اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ رہا۔ لیکن اس کی بہو بولی۔

"بابا ــــ تھی کے لیے ہم سب کچھ کرینگے۔ مہاوت کی بیٹی میری منہ بولی بہن ہے۔ میں ابھی جا کر اس سے کہتی ہوں کہ اپنے ابا سے کہہ کر تور دئی کو بچالے"۔

شہر میں منادی ہو گئی۔ لوگ جوق در جوق میدان میں جمع ہونے لگے۔ کتوں سے تو بچ گیا لیکن ہاتھی بڑا ظالم ہے۔ یہ نہیں چھوڑے گا بچارے کو ــــ

اتنے میں ایک مست و خونخوار ہاتھی چنگھاڑتا، کودتا، اُڑتا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ لوگ سہم گئے۔ سب کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ فیل مست نے تور دلیئ کے پاس آ کر اپنا خوفناک پاؤں اٹھایا۔ لوگوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ہاتھی نے پاؤں زمین پر مارا زمین دہل گئی۔ لوگوں نے سمجھا تور دلیئ کا نام و نشان تک نہ رہا ہوگا لیکن وہ زندہ و سلامت موجود تھا۔ لوگوں نے کہا یہ شخص ضرور کوئی جادوگر ہے ——— شہنشاہ نے سنا تو برہم ہو کر کہا اسے ہمارے حضور پیش کیا جائے۔ تور دلیئ کا بر بور منور شہنشاہ کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔

شہنشاہ نے تور دلیئ پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور منور سے مخاطب ہو کر بولا "کیا یہی وہ باغی ہے جس نے مابدولت کے مقابلے میں منڈروں کی مدد کی اور تمہارے گاؤں پر ڈاکے ڈالے؟"

منور نے کہا "جی حضور" ——— پھر شہنشاہ نے تور دلیئ سے کہا "اے بدبخت تو نے شہنشاہِ ہند کے حرم سرا میں داخل ہونے کی کیسے جرأت کی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا۔ کہ تمہیں یہ جرأت کتنی مہنگی پڑے گی" ——— شاہ کی گرجدار آواز گونج رہی تھی۔ دربار پر مہیب سناٹا طاری تھا۔

رحم، رحم، ان داتا ——— دور سے بھگوان، شہی اور تتا کی آوازیں آئیں جنہیں چوبدار نے اندر آنے سے روک دیا تھا ——— "فریادیوں کو حاضر کیا جائے" ان داتا نے حکم دیا۔

"ان داتا، تور دلیئ کی جان بخشی کی جائے۔ ورنہ اس دوشیزہ کا سہاگ لٹ جائے گا۔" بھگوان نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ——— تمہارے ناموس

پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش [illegible] اور [illegible] جرم [illegible] داخل ہو [illegible] قانون کی اس کی سزا اسے ضرور ملنا [illegible] آخری حکم سنا دیا۔

"بھائی منور۔ [illegible] وہ ہمارا اور تم اس [illegible] ہو۔ تمہاری بات [illegible] کی جان بخشی کرا دو۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں" [illegible] اپنا دامن پھیلا [illegible]

دوسرے ہی لمحے منور شاہ کی خدمت میں [illegible] کورنش بجا لایا اور [illegible] توردی کی جان بخشی چاہی۔

"تعجب ہے کہ تم اپنے دشمن کی جان بچانا چاہتے ہو۔"

"ان داتا! بجا فرماتے ہیں [illegible] اسکی اور میری دشمنی قبیلوی ہے۔ جو اپنے وطن تک محدود ہے وہاں میری تلوار اس کا خون پینے کو بے قرار رہتی ہے۔ لیکن یہ میرا مہمان ہے اس لئے مجھے میرا قومی فرض مجبور کر رہا ہے کہ میں اسکی جان بچاؤں۔"

"لیکن بادولت کا حکم ناطق ہے۔ اس پر کوئی قلم بھی خط تنسیخ نہیں کھینچ سکتا۔ ہم تمہاری سفارش کو بے محل قرار دیتے ہوئے حکم دیتے ہیں کہ تمہیں ہی اپنے اس مہمان کا خون بہانا ہوگا۔"

"ظل اللہ — میرے خون میں ابھی غیرت و حمیت کے شرر موجود ہیں۔ پس میری تلوار اپنے بھائی کے خون سے رنگین نہیں ہو سکتی اور نہ ہی میری موجودگی میں کوئی دوسرا شخص اس کا خون بہا سکتا ہے [illegible] مجبور ہوں۔ کیونکہ یہ میرے قومی وقار کا سوال ہے۔ میں آخری مرتبہ درخواست کرتا ہوں کہ توردلوٹ کو چھوڑ دیا جائے اور جس جرم میں اسے قتل کی سزا دی گئی ہے وہ [illegible] ہمارا ایک پٹھان

دوشیزہ کو عنایت کیا جائے۔ اس کے عوض میرا سر حاضر ہے"۔۔۔
منور نے شاہی رعب و جلال کی آخری حدوں کو چھو لیا تھا۔
"تمہاری یہ جراٗت قابل مذمت ہوتے ہوئے بھی ما بدولت کو پسند آئی۔ اس لئے ہم حکم دیتے ہیں۔ کہ تور دلی کو رہا کر دیا جائے اور ملکہ کا ست لڑا ہار اس پٹھان دوشیزہ کو پہنا دیا جائے۔ اور اس کے بدلے منور کو اسی وقت برسرِ عام تختۂ دار پر کھینچ دیا جائے۔"

اس حکم کے ساتھ شہنشاہ ہند نے دربار برخواست کر دیا۔
ننھی اور تور دلی نے منور کے پاؤں پکڑ لئے ۔۔۔ "منور بھائی یہ تو نے کیا کیا۔ ہم قبیلے کو کیا منہ دکھائیں گے"۔
منور نے دونوں کو اٹھا کر گلے لگا لیا۔۔۔ "ننھی بہن تیرا سہاگ تجھے مبارک ہو۔ شکر ہے اللہ نے مجھے تمہارے سامنے سرخرو کیا ۔۔۔ تور دلی بھائی مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم پر بڑے ظلم کئے۔ میرا خون اگر میرے گناہوں کا کفارہ ہو سکے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔ امید ہے اب تمہارے دل میں میری طرف سے کوئی کدورت نہ ہوگی۔"

بھگوان اور لتا نے اپنے مہمانوں کو آنسوؤں کے ہجوم میں الوداع کہی۔ کشتی اٹک کی تند و تیز موجوں پر بہے جا رہی تھی۔ خیر آباد پہنچ کر وہ کشتی سے اُترے۔ اور پیدل چل پڑے۔ محبت کے ان پروانوں کو اکوڑے کے قریب ایک جنگل میں رات بسر کرنی پڑی۔ نصف شب کے قریب ننھی کو پیاس محسوس ہوئی۔ سنسان جنگل کی دہشتناک ویرانی، گھپ اندھیرا اور پانی کی تلاش ۔۔۔

بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے ایک طرف پہاڑی کے دامن میں خانہ بدوش کوچیوں کے ڈیرہ نظر آئے۔ تور دلئی نے اس طرف کا رخ کیا ۔۔۔ خیموں کے قریب پہنچا۔ تو کوچیوں کے خونخوار کتے بھیڑیوں کی طرح اس پر جھپٹے ۔۔۔ کتوں کا شور سن کر کوچی بیدار ہوئے اور سمجھے شاید ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔ وہ تلواریں سونت کر نکل پڑے اور اندھیرے میں بیسیوں تلواریں تور دلئی پر ٹوٹ پڑیں۔

ادھر ہانیی کی شدت سے شبی کا برا حال ہو رہا تھا۔ جب کافی دیر گزر گئی اور تور دلئی نہ لوٹا۔ تو وہ مجبور ہو کر اسکی تلاش میں نکلی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ کوچیوں کے خیموں کو دیکھ کر وہ اسی طرف چل پڑی۔ اور جب خیموں کے نزدیک پہنچی۔ تو تور دلئی کی لاش کو خون میں نہایا ہوا پایا۔ وہ تور دلئی کہہ کر اسکی لاش سے چمٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔

"تور دلئی ڈاکو تور دلئی ۔۔۔ کوچیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ وہ دوڑے دوڑے آئے۔ شبی کو لاش سے جدا کیا۔ لیکن آہ وہ بھی اپنے محبوب کے پاس جا چکی تھی۔

خانہ بدوشوں کے اس چھوٹے سے بنتے کھیلتے جزیرے میں یک لخت افسردگی چھا گئی۔ اچانک اور ناحق دو انسانوں کا خون ہو جانے پر سارا قافلہ پریشان تھا۔ وہ ان لاشوں کو دفنانے کے متعلق سوچ ہی رہے تھے۔ کہ شہنشاہ اکبر کے سپاہیوں کی بھاری جمعیت ایک جنازہ اٹھائے ہوئے ادھر سے گزری۔ اور جب انہیں پتہ چلا۔ کہ تور دلئی قتل ہو چکا ہے اور شبی مر چکی ہے۔ تو ان کی لاشیں بھی اپنے ساتھ ہی لیتے گئے۔

مندڑ اور یوسف زئی قبیلوں کو اس مشترک المیئے نے ایک صف میں کھڑا کر دیا۔ دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی تیر لگا تھا۔ دونوں کو ایک ہی تلوار نے زخمی کیا تھا۔ دونوں کے ہرے بھرے فصل ایک ہی بجلی نے پھونک دیئے تھے۔ دونوں کے دل ایک ہی سیخ میں پروئے گئے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے —— محبت، غیرت اور حمیت کے ان تینوں شہیدوں کو اسی سرسبز و شاداب چراگاہ میں دفن کر دیا گیا۔ جسے ہزاروں مندڑوں اور یوسف زئیوں کے خون نے سینچا تھا۔

میمونئ

'وہ مارا' شیر عالم نے غلیل سے پتھر چھوڑتے ہوئے کہا

"'چہ چہ چہ چہ' — یہ تم نے کیا کر دیا۔ شیر عالم۔ خدا کو کیا جواب دوگے؟ بڑے بے رحم ہو۔ ایک بے زبان پر اتنا ظلم" میمونئ نے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کا چہرہ چنبیلی کے پھول کی طرح پیلا پڑ گیا۔

'اس کم بخت کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ شیر عالم نے قدرے سنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

"مجھے کسی کی بے وفائی اچھی نہیں لگتی۔ چاہے وہ فاختہ ہی کیوں نہ ہو۔ دیکھتی نہیں اس بیچارے کو کتنا ستا رہی تھی۔ کبھی اس شاخ پر جاتی تھی کبھی اس پر، اور وہ بیچارا اس کے پیچھے ہلکان کبھی یہاں کبھی وہاں" — شیر عالم نے غصّے سے ہانپتے ہوئے کہا۔

'لیکن تم تو سچ مچ — میمونئ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

'سچ مچ نہیں تو اور کیا جھوٹ — اگر تم سے ایسی حرکت ہو۔ تو میں تمہارا بھی یہی حال کر دوں — شیر عالم نے میمونئ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

'میرا بھی' — میمونئ نے سینہ کوٹتے ہوئے کہا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی "تم سے یہی توقع ہے۔ سنگدل کہیں کے"۔۔۔

'بیچاری تم تو رونے لگی، آخر عورت ذات ہونا۔ بات کا بتنگڑ بنالیتی ہو۔ بھلا بتاؤ تو یہ بھی کوئی رونے کی بات ہے۔ یہ کھیل تو ہم روز کھیلتے ہیں۔ اگر اس طرح اپنا نشانہ نہ پکائیں۔ تو کل کلاں بندوق کی گولی دشمن کے سینے کو کیسے نشانہ بنائے گی ——— اچھا چلو، اٹھو۔ اب تمہاری چہیتی فاختہ کو چل کر دیکھ آئیں۔ چلو چلو، بس چھوڑو اب رونا دھونا ——— میری میمو ——— شیر عالم نے میمونہ کی کلائی تھام کر خوشامدانہ لہجے میں کہا ——— اور پھر دونوں بید مجنوں کے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ جہاں فاختہ، زخمی فاختہ اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ فاختہ سسک رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ ننھی جان غلیل کے نکیلے پتھر کی تاب نہ لاسکی وہ آنکھیں بند کئے جانکنی کا شدید کرب برداشت کر رہی تھی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے جان دے دی۔ اور میمونہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے بڑے بڑے قطرے اس کے پھول ایسے رخساروں پر اوس کی طرح ڈھلک آئے۔

'چہ چہ چہ بچاری، میری میمونہ کی سہیلی تھی۔ اللہ بخشے بی فاختہ کو، اب کیا ہوگا' ——— شیر عالم نے شرارتاً مسکراتے ہوئے کہا۔ 'ہوگا کیا، خدا اسے جنت کے درختوں پر جگہ دیگا۔ غریب بے گناہ تھی۔ اس کا خون تمہاری گردن پر' ——— میمونہ نے شیر عالم کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

'اچھا بھئی۔ بس بڑی سیر ہو چکی۔ چلو اب چلیں۔ شیر عالم بولا۔ اور پھر دونوں کہساروں کے پیچ در پیچ راستوں میں کھو گئے۔

باجوڑ کے فلک بوس کہساروں کا لامتناہی سلسلہ اپنے سینے پر صنوبر کے بیشمار لمبے تڑنگے درختوں کو سجائے میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ چنار اپنے سروں پر شفق رنگ اوڑھنیاں ڈالے ایستادہ تھے۔ زمین سے لگے ہوئے سرسبز و شاداب پودے بچوں کی طرح سہمے کھڑے تھے۔ اونچے نیچے درختوں کی لٹکتی ہوئی ٹہنیاں "گرگرے" کے سیاہ دانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے کالے، اودے اور نیلے موتیوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پرو دیا ہو۔ شیر عالم نے فوراً گردن میں حمائل کی ہوئی غلیل نکالی اس میں ایک گول مول پتھر جمایا اور گرگرے کی ایک بھرپور شاخ کو نشانہ بنایا۔ ایک دم جیسے اودے نیلے موتیوں کا مینہ برس پڑا۔ اور پھر دونوں نے ان رس بھرے موتیوں سے جھولیاں بھرنا شروع کر دیں، اور پھر دونوں ہرنی کے بچوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گاؤں کا آخری موڑ مڑ گئے۔

——اور پھر اسی طرح، دن، مہینے اور سال گذرتے گئے۔ کوہستان باجوڑ کے ہنستے بولتے گاؤں "ناوہ گئی" میں ہزاروں سورج طلوع ہوئے۔ ہزاروں راتوں نے کبھی اسے اپنے سیاہ آنچل اور کبھی تاروں بھری اوڑھنی میں لپیٹا —— میموئی اور شیر عالم کا بچپن بھی انہیں فضاؤں میں پروان چڑھتا رہا۔ اور آخر ایک دن گاؤں کے کچے گھروں کی دیواروں، سہمے سہمے سرسبز پودوں، صنوبر کے درختوں اور گرگرے کی بھرپور ٹہنیوں نے چشموں اور ندیوں کے شفاف آئینے میں ان کے شباب کا عکس دیکھا اور دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی جوانی کی خبر ہر کان نے بھی سنی۔ اور ان کو ہلال بکد ربنتے ہر آنکھ نے دیکھا۔ میموئی اور شیر عالم کی باہمی محبت اب بچپن کا کچا دھاگا نہ رہی۔ بلکہ اب وہ جوانی کی حسین و جمیل زرکار ڈوری میں

تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ صرف بچپن کے ساتھی ہی نہ تھے بلکہ ان میں چاند چکور کا سا رشتہ تھا ——— شیر عالم کی پھوپھی میمونئی کی ماں، اور میمونئی کا ماموں شیر عالم کا باپ، اپنے بچوں کا باہمی پیار دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتے۔

میمونئی نے ... کوہسار باجوڑ کی دلکش نظم "نادہ گئی" کی آبرو، ہر جوان کے دل کی دھڑکن، ہر رباب کا نغمہ، ہر زبان کی داستان، روان قبیلے کی ناک، گاؤں کی دوشیزاؤں کا سنگار۔

شیر عالم ——— "نادہ گئی" کا جوان، رعنا، قدآور اور بے داغ جوان، قبیلے کی آنکھ کا تارا، جسے دیکھ کر گاؤں کی دوشیزاؤں کے دل میں گدگدی ہوتی۔ وہ دل ہی دل میں میمونئی کی قسمت پر رشک کرتیں۔

کہتے ہیں ——— ھکی کا پسا رہ جاتا ہے، لیکن دانتوں کا پسا باقی نہیں رہتا۔ ——— شیر عالم کو "نادہ گئی" کی لڑکیوں کی نظر کھا گئی ——— اس پر اچانک چیچک نے حملہ کر دیا۔ "نادہ گئی" کے چاند کو گہن لگ گیا۔ سورج کے نورانی چہرے پر تیزاب چھڑک دیا گیا۔ شیر عالم کا انار جیسا چہرہ کوئلے کی طرح جل کر سیاہ ہو گیا۔ میمونئی کے ارمان جھلس گئے۔ اس کے پھولوں بھرے باغ کو بجلیوں نے پھونک دیا۔ وہ شیر عالم کی چارپائی کے ساتھ لگی پیروں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہتی۔ اور شیر عالم آنکھیں بند کئے شدت مرض میں کراہتا رہتا ——— جس دن سے شیر عالم بیمار ہوا تھا میمونئی گم سم کھوئی کھوئی رہتی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیوانوں کی طرح ہر ایک کو تکتی۔

شیر عالم کی جیون ناؤ اس بھنور سے سلامت نکل آئی۔ وہ اپنا حسن دے کر زندگی خرید لایا۔ اور میمونئی نے اسی کو غنیمت جانا۔ وہ بہت خوش تھی جس دن شیر عالم

نے غسلِ صحت کیا۔ اس دن میمونی نے شہید بابا کے مزار پر نیاز بانٹی اور پاپا ہو بیوں کے حجرے میں زیارت گئی۔ وہ اس دن جیسے چہار ہی تھی۔ لیکن اب اس کی سہیلیوں کو شیر عالم کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب تو انہیں شیر عالم کے نام سے بھی گھن آتی۔ میمونی اس راز کو پاچکی تھی۔ وہ خوش تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ شیر عالم اب اس کا اور صرف اسی کا ہے۔

ایک مدت تک، شیر عالم کی بیماری گاؤں کے ہر قریے اور گھر کا اہم موضوع بنی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اب میمونی شیر عالم سے نفرت کرنے لگے گی۔ میمونی کو دل وجان سے چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ سارے گاؤں کے جوان خوش تھے۔ ان میں سے ہر ایک اب میمونی کے حصول کے لئے کوشاں تھا۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ نادہ کمی کا یہ تازہ پھول اسی کی دستار کی زینت بنے۔ لیکن ان کا خیال غلط نکلا۔ میمونی کی محبت پتھر کی لکیر تھی۔ اس کی والہانہ محبت سے شیر عالم بھی حیران تھا۔ بیماری کے دوران میں جن شکوک نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ وہ اب آہستہ آہستہ زائل ہو رہے تھے۔ میمونی کے انگ انگ نے بدصورت اور کریہہ المنظر شیر عالم کے آغوش میں ہی راحت محسوس کی۔ اور پھر ایک دن جب ڈھول سرنا نے گلا پھاڑ پھاڑ کر شیر عالم اور میمونی کی شادی کا اعلان کیا۔ تو سارے گاؤں پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ آخر شادی ہو گئی۔ دونوں کو ازدواجی رشتے میں دو موتیوں کی طرح پرو دیا گیا گاؤں کی ہر آنکھ میں طنز اور تعجب تھا۔ ہر زبان پر تضحیک تھی — میمونی اور شیر عالم — ؟ زندگی کی آغوش میں موت ؟ شہزادی کے سر پر کانٹوں کا تاج — ؟ انگور کی بیل کے ساتھ کیکر کی شاخ کا ملاپ — ؟ زہر اور شہد ایک پیالے میں — ؟ غرض جتنے منہ اتنی

باتیں ـــــ اب شیر عالم اور میمونہ ـــــ "ناد گیٔ" کے گلزار میں، "لالہ" داغدار اور نرگس شہلا کی طرح ایک ساتھ رہنے لگے۔ ان کی زندگی اور میل جول پر چاند کی سنہری دنیا، سورج کی نورانی دھرتی۔ رات کی بیلاہٹ اور دن کی برنائی رشک کرنے لگی میمونہ نے شیر عالم کو اپنے گریبان کا پھول اور شیر عالم نے اسے اپنی دستار کا طرہ بنا کر رکھا۔ دونوں کی محبت بھری زندگی بڑے خلوص اور پیار سے گزر رہی تھی۔ پھول اور بھنورے کی طرح دونوں کی محبت بے فانی تھی۔

ایک دن شیر عالم کو کسی کام سے باہر جانا پڑا۔ اتفاق سے وہ رات واپس گھر نہ آسکا۔ یہ رات میمونہ نے انگاروں پر کاٹی ـــــ اس رات حجرے میں مہمانوں کی بڑی ریل پیل تھی تخت ہزارہ ربابی "بہرام دگل اندام" کا قصہ رات گئے تک سنا تا رہا چلم کے مسلسل دور جو چلے تو ایکا ایکی تمباکو ختم ہو گیا۔ سب کو شیر عالم کی عدم موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ ہمیشہ ایسے آڑے وقت میں اپنے نیفے میں اڑسی ہوئی تمباکو کی تھیلی نکال کر حجرے کی لاج رکھ لیا کرتا لیکن آج وہ نہ تھا۔ اور دوسرے کسی سے تمباکو کا ملنا محال تھا۔ آخر مجبوراً کرتے۔ شیر عالم کے گھر گیا۔ اور میمونہ سے تمباکو مانگ لایا ـــــ دوسرے دن جب شیر عالم گھر آیا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ کرتے رات کو تمباکو لے گیا تھا۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ "چلو اچھا ہوا حجرے کی عزت بھی رہ گئی اور شیر عالم کا نام بھی ہو گیا۔ ورنہ مہمان کیا کہتے۔ کہ سارے گاؤں میں تمباکو کی ایک چٹکی بھی نہیں تھی۔ یہ خیال کے آتے ہی شیر عالم کی گردن فخر سے تن گئی۔ اور غیر شعوری طور پر اس نے اپنے گنبد نما زرکار کلاہ پر بندھی ہوئی پگڑی کو دائیں ہاتھ سے ٹیڑھا کرکے ابروؤں پر لگا دیا۔ میمونہ اپنے کجکلاہ کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہی تھی۔

صنم خان ۔ نادہ گئی کا رسوا نے عالم عیار اور شیر عالم کا رقیب میمونی اور
شیر عالم کی محبت صنم خان کے لئے ایک مستقل روگ تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ
میمونی، چیچک رو شیر عالم کو چھوڑ کر اس کی ہو جائے لیکن ہر بار اسے منہ کی کھانا
پڑی۔ اور اس طرح روز بروز اس کی رگ رگ میں انتقام کا زہر سرایت کرتا گیا۔ وہ
جب بھی شیر عالم کو دیکھتا۔ اس کے روئیں روئیں میں سوئیاں سی چبھنے لگتیں، اب وہ
شیر عالم کو ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگا۔ لیکن وہ بزدل تھا۔ اس میں خود مقابلے میں
آنے کی ہمت نہ تھی۔

ایک دن ـــــ شیر عالم اپنے نشیبی کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ دھوپ
'نادہ گئی' کے نشیب و فراز پر سیال چاندی کی طرح پھیلی ہوئی تھی ـــــ اس کے
ہاتھ کام میں لگے ہوئے تھے لیکن اس کا ذہن میمونی کے ساتھ مصروف اختلاط تھا،
اس کی سوچ کے ہر موڑ پر میمونی کھڑی اسے بلا رہی تھی۔ اور وہ خیال ہی میں جب اس
موڑ پر پہنچتا۔ تو میمونی کو پری کی طرح غائب پاتا۔ ابھی اس کی نگاہیں میمونی کو درختوں
اور پودوں کی آڑ میں تلاش ہی کر رہی ہوتیں۔ کہ یکایک دور سے اس کے کانوں میں
ایک رسیلی آواز آتی، دور ایک کنگرے پر میمونی حور کی طرح کھڑی مسکرا رہی ہوتی۔ اور
وہ تصور ہی میں کودتا پھاندتا اس موڑ تک جا پہنچتا اور جونہی وہ اسے اپنے آغوش میں
لینے کے لئے ہاتھ پھیلاتا۔ تو وہ ایک دم فضا میں تحلیل ہو جاتی اور پھر فوراً ہی کسی درخت
کے سائے میں کھڑی نظر آتی ـــــ

"شیر عالم ـــــ شیر عالم"۔ ایک درشت و کرخت آواز نے اس کے
اس رومانی تانے بانے کو کاٹ کر رکھدیا۔ اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو صنم خان

تھا۔ اس نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی۔

"السلام علیکم ۔ کن خیالات میں گم ہے میرا شہزادہ" صنم خان نے طنز کا ایک تیر پھینکا۔

لیکن شیر عالم اسے پی گیا "عادت ہے کم بخت کی۔ ڈھیٹ کہیں کا"۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بدبخت کی ایسی ویسی باتوں کا کوئی جواب نہ دیگا۔

"آؤ بھئی صنم خان، آؤ بیٹھو، تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو، کہاں سے آرہے ہو، بیٹھو آرام کرو ـــــ وہ رہی چھاچھ۔ اور چادر میں روٹی اور پیاز بھی ہے" شیر عالم نے بظاہر اسے خوش آمدید کہکر اپنا قومی فرض ادا کیا۔ "عیش کرو دوست عیش، آج کل تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں۔ خود تو شہد دودھ اور گھی میں نہا رہے ہو۔ اور ہم غریبوں کو خالی خولی پیاز روٹی پر ٹرخانا چاہتے ہو۔" صنم خان نے پھر ایک تیر پھینکا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں صنم خان، وہی ازل سے جو قسمت میں لکھا ہے مِل جاتا ہے۔" شیر عالم نے ایک دفعہ پھر کڑوا گھونٹ حلق سے اتار لیا "قسمت کی بھی ایک ہی کہی، دراصل فرشتے بھی کبھی کبھی غلطی کر جاتے ہیں۔ ناک نقشہ دیکھے بغیر ہی تقدیر لکھ مارتے ہیں۔" صنم خان نے ایک اور وار کیا ـــــ اور اس وار سے شیر عالم ذرا چونک سا گیا۔ اس کے چہرے پر دبے دبے غصے کی ہلکی ہلکی سرخی پھیل گئی۔

"یہ آج کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ صاف صاف بات کرو۔ بزدل کی طرح چھپ کر وار کرنا پٹھان کا شیوہ نہیں۔" شیر عالم کے چہرے کی سرخی الفاظ کے روپ میں آگئی۔

"اچھا تو گویا اب ہم پٹھان بھی نہیں رہے ہے۔ تم جیسا بے غیرت بھی میری نخوت ڈ،

پر انگلی دھرنے لگا ـــــ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھ "صنم خان نے پتھر کھینچ مارا۔

"سارا گاؤں جانتا ہے۔ کہ بے غیرت کون ہے۔ تو یا میں" ؟ ـــــ شیر عالم کے چہرے کی سرخی گہری ہو گئی۔

گاؤں تو جانتا ہی ہے۔ لیکن تمہیں بھی جاننا چاہیئے۔ تم بھی سب کچھ جانتے ہو مگر جان بوجھ کر بے غیرت بنے ہوئے ہو۔ صنم خان نے ایک بھرپور وار کیا۔

"اگر تم اس وقت میرے کھیت میں دکھائی دیتے تو اس بدزبانی کا مزہ چکھا دیتا۔ مگر افسوس ـــــ" شیر عالم نے ایک دفعہ پھر بات لٹا لینے کی کوشش کی۔

"کرنے کو مزہ کیوں نہیں چکھاتے۔ جو رات کے وقت تمباکو کے بہانے تمہاری میمونہ کے پاس جاتا ہے۔ بڑے آئے مزہ چکھانے والے" صنم نے اپنی پوری قوت کے ساتھ ایک زہر ملا تیر پھینکا۔ جو کارگر ثابت ہوا ـــــ

"خاموش بدذات۔ بکواس بند کرو" شیر عالم تن کر سامنے آگیا۔ وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آواز میں بجلی کی کڑک تھی، وہ انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھیت سے باہر نکل آیا۔

"ایک تیر دو فاختہ، اب مزہ آئے گا۔ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی سلامت رہیگی" ـــــ صنم خان اپنے کاری وار پر اترا رہا تھا۔

کچی دوپہر تھی ـــــ 'نادہ گئی' کی فضا میں گھریلو تنوریوں کا سفید وسیاہ، غلیظ وکثیف ہلکا اور گھنا دھواں مختلف روپ دھارے پھیل رہا تھا ـــــ دھوئیں کی لکیریں کبھی تیر کی انی میں تبدیل ہو جاتیں۔ تو کبھی اژدہوں اور سانپوں کی طرح پھن

پھیلائے سورج کا منہ چڑاتیں۔ اور کبھی کوئی ڈراؤنی شکل اختیار کر لیتیں۔ بھوت پریت، جن۔ دیو۔ ڈائن پچھل پائی ـــــــ اور پھر دیکھتے دیکھتے فضا میں تحلیل ہو کر نیلے آکاش کا جزو بن جاتیں۔ ایسے لگتا جیسے صدیوں کے تلخ و کثیف دھویں اور قرنوں کی مہیب شکلوں نے مل کر ہی آسمان کو جنم دیا ہے ـــــــ ستم ظریف آسمان۔

تنوریاں دھک رہی تھیں۔ ہر تنوری کے گرد بڑی بوڑھیوں اور کنواریوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا معمول کی طرح ہر ایک اپنے اپنے آٹے کا برتن لئے اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی ـــــــ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن پھر بھی وہ روز والی ہماہمی اور گہما گہمی نہ تھی۔ چہل پہل تھی لیکن اس میں خوشی کی لہر مفقود تھی۔ چوڑیوں کے چھناکے تھے۔ لیکن ان میں ترنم کی جگہ بین تھے۔ کراہیں تھیں۔ بھیانک سرگوشیوں کی سرسراہٹ سے ہر دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آج کنواریوں کی چہلوں میں زندگی نہ تھی۔ ان کے قہقہوں پر زہر خند کا گمان ہوتا تھا۔ فضا گھٹی گھٹی تھی جیسے کوئی سازش ہو رہی ہو۔

میمونئی کے گھر بھی، تنوری پر اڑوس پڑوس کی لڑکیوں کا میلہ لگا ہوا تھا ـــــــ پلوشہ نے چنارے کو گدگداتے ہوئے کہا، "اری، انگوڑی بس ہٹ پرے دفان ہو، آخر ہم نے بھی آٹا پکانا ہے۔"

اور چنارے نے کہا ـــــ "پلوشہ بہن، آج تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔ خدا خیر کرے !"

"یہ آج تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اللہ اللہ کرو۔" منے نے چنارے کو ٹوکا۔

ریحانہ بولی: "نا بھئی چنار ٹھیک کہتی ہے۔ آج تو میری طبیعت بھی گھبرا رہی ہے۔ میرا بھائی سفر میں ہے۔ خدا اسے جلدی بخیر واپس لائے"۔ اور سازہ نے جو ابھی تنوری پر چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ اپنا آٹا پکا رہی تھی۔ اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"یہ آج بات کیا ہے۔ روٹی لگتی ہی نہیں۔ میری دو روٹیاں جل کر کوئلہ ہو گئیں۔ اور یہ دیکھو میرا ہاتھ بھی جھلس گیا ہے!" اس نے اپنا مہندی والا بھیگا ہوا ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔ اور اسی میں میمونٹ ہاتھ میں آٹے کا برتن سنبھالے، اٹھلاتی قہقہے لگاتی سہیلیوں کے تنور کی طرف آئی۔

"یہ آج تم سب کو ہو کیا گیا ہے۔ نہ بات، نہ ہنسی نہ مذاق، نہ کوئی ٹپہ نہ گیت جیسے کسی میت کی صف پر بیٹھی ہو۔" میمونٹ کو سہیلیوں کی خاموشی اچھی نہ لگی۔

"بیٹی! دیکھتی نہیں ہو۔ سازہ کی روٹیاں جل گئیں۔ ہاتھ جھلس گیا ہے بیچاری کا۔ اور ویسے بھی آج قدرتی طور پر بات کرنے یا ہنسنے ہنسانے کو جی نہیں چاہتا۔ معلوم نہیں کیا بات ہے۔ اللہ خیر کرے" --- خالہ شیخے نے اپنا منہ بسورتے ہوئے کہا۔ اور میمونٹ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ جیسے بے شمار چاندی کے جھنجھنے ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔

"خالہ شیخے۔ تمہارا دماغ اب کام نہیں کرتا۔ جبھی تو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ سازہ کو روٹیاں پکانے کا سلیقہ پہلے کب تھا۔ آج ہی میں دیر سے پہنچی تو رزق کا ستیاناس کر دیا کم بخت نے۔ یہ تو بس تیار خور ہے۔ جیسے کوئی شہزادہ اسے بیاہ لے جائے گا۔ ہٹ پرے ہو سازہ کی بچی میں خود ہی سب روٹیاں پکاؤں گی۔" اور میمونٹ ہنستی چہچہاتی۔ قہقہے لگاتی۔ دہکتی تنوری کے دہانے پر جا کھڑی ہوئی۔

صحن کا دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ جیسے کسی نے پوری قوت کے ساتھ دروازہ توڑ ڈالنے کا تہیہ کر لیا ہو۔

"شیر عالم لالہ" ـــــــ سب لڑکیوں نے یکزبان ہو کر کہا۔ اور اپنے اپنے گھونگھٹ نکال دیوار کے سائے میں چھوئی موئی بنکر کھڑی ہو گئیں۔

میمونہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ شیر عالم کو دیکھکر وہ اپنے آپ میں نہ رہی لیکن سہیلیوں کی موجودگی میں اسے اپنے جذبات پر قابو پانا پڑا۔ وہ کھل کر بات نہ کر سکتی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوشی کی شفق پھول آئی۔ شیر عالم کے ہاتھ میں سیماب کی طرح چمکتی ہوئی چھری تھی۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ میمونہ کی آنکھوں پر محبت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مسرت کے جذبات نے اسے مغلوب کر لیا تھا۔ وہ نہ تو چھری دیکھ سکی۔ اور نہ ہی شیر عالم کے غصے کا اندازہ کر سکی۔ شیر عالم ایک ہی جست میں میمونہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ لڑکیاں کف در دہان شیر عالم کو دیکھکر لاجونتی کے نرم و نازک پتوں کی طرح تھر تھر کانپنے لگیں۔

"بدکار عورت۔ تجھے شرم نہ آئی" شیر عالم نے پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے کہا۔

"آج پھر کیا دل لگی سوجھی ہے ـــــــ؟" میمونہ نے شیر عالم سے ہنستے ہوئے کہا۔

"دل لگی کی بچی۔ تم مجھے ہمیشہ بے وقوف بناتی رہتی ہو۔ لیکن آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑونگا۔"

"بے وقوف ـــــــ؟ آخر بات کیا ہے۔ چلو آرام کرو۔ آج شاید پھر کام زیادہ کیا ہے تم سے سو بار کہا کہ زیادہ کام نہ کیا کرو۔" میمونہ بدستور ہنس رہی تھی "میں جب تک تجھے حلال نہ کر لوں۔ آرام نہیں کرونگا۔ تم نے اگر کرمے کے ساتھ منہ کالا کرنا تھا

تو مجھے اپنا منحوس چہرہ کیوں دکھایا؟" اب شیر عالم اپنی پوری قوت سے چیخ رہا تھا۔

"کرے سے منہ کالا ۔۔۔ ؟ شیر عالم یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بڑے آئے تو میرا بھائی ہے ۔۔۔ بھئی یہ مذاق اچھا نہیں۔ مجھے ڈر ہے۔ تم ایک دن ہنسی مذاق میں کچھ کر نہ بیٹھو" ۔۔۔ میمونہ کی ہنسی اور مسکراہٹ کو شیر عالم کی خونی آنکھیں اور چمکتی چھری بھی نہ دبا سکی۔

"میمونہ بیٹی! پرے ہٹ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ شیر عالم کی آنکھوں میں قاتلوں کی طرح خون اترا ہوا ہے۔ چلی جاؤ بیٹی۔ میری شہزادی بیٹی ۔۔۔" خالہ شیخے نے چلاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو خالہ، شیر عالم میرا خاوند ہی نہیں۔ میرے ماموں کا لڑکا بھی ہے یہ کبھی مجھے ذبح نہیں کرے گا۔" اب کے ہنستے ہنستے میمونہ کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

"تمہاری یہ چالاکی مجھے اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

بدکار عورت! اب تم اس قابل نہیں ہو کہ 'نادہ گئی' کی زمین پر سانس لے سکو۔ تمہارے گناہ کا کفارہ تمہارا خون ہی ہو سکتا ہے۔ اور پھر شیر عالم کے خونی پنجوں نے 'نادہ گئی' کی شہزادی کو بالوں سے گھسیٹ کر زمین پر پچھاڑ دیا ۔۔۔ بیدرد شیر عالم اجرتی قاتل کی طرح میمونہ کے پرخلوص سینے پر چڑھ بیٹھا اور ایک بے رحم قصاب کی طرح اس کے نرم و نازک گلے پر چھری چلا دی ۔۔۔ جوان، تندرست، پاکیزہ اور بے گناہ تازہ خون کا ایک فوارہ ابلا۔ جس نے شیر عالم کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا اور اس کی پیاسی چھری کو سیراب کر دیا۔ آنے

کے برتن اور پکی ہوئی روٹیوں پر میمونہؓ کے لہو نے نقش و نگار بنا دیئے۔

میمونہؓ کی سہیلیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اُنہوں نے اپنے بال نوچ ڈالے،

خالہ سیتجے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اور سارے "ناوہ گیٔ" کے جنگل میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ میمونہؓ کو شیر عالم نے پکی دوپہر میں ذبح کر ڈالا۔

لڑکیاں آٹے کے برتن تنوریوں پر چھوڑ کر سراسیمہ و پریشان گرتی پڑتی بے گناہ میمونہ کے ماتم میں شریک ہو گئیں۔

ادبیاتِ سرحد

پاکستان کے نامور فنکار فارغ رضا صرف اعلےٰ درجے کے شاعر اور ادیب ہی نہیں بلند پایہ محقق اور نقاد بھی ہیں۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کی رائے ہے۔

"فارغ رضا کا یہ ادبی کارنامہ ناقابل فراموش ہے۔ اُنھوں نے پورے ادارے کا کام تنہا انجام دے ڈالا"

سرحد کے طول و عرض میں ایک عرصہ سے جاری ادبی تحریکوں اور زبان و ادب کی بھرپور تاریخ۔

ادبیات سرحد جلد اول (پشتو ادب) رضا ہمدانی قیمت ۵/۸

ادبیات سرحد جلد سوم (اردو ادب) فارغ بخاری قیمت ۸/-

مُنتخب ادب

منتخب ادب اسی تدریجی ارتقا کی ایک نئی اور مضبوط کڑی ہے۔ جسے فارغ بخاری اور رضا ہمدانی جیسے بالغ نظر ادیبوں نے ترتیب دیا ہے۔

قیمت۔ ۵/۱۲

رنگ مینا

- رنگین آنچلوں کی رومانی ملبوس ازم
- پھول اور کانٹوں کا مشک بیز گلدستہ
- غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج

رضا ہمدانی

کی منتخب غزلیات کا مجموعہ

قیمت — دو روپے

★

قفس رنگ

فارغ بخاری کے ذہن و فکر کے جن ہیولوں نے زندان کی تاریکی میں جنم لیا، اب وہ شعر کا روپ دھار کر آزاد فضا کے اجالے میں روشناس ہو رہے ہیں۔

قیمت —— تین روپے

★

قید و بند

زندان کی چار دیواری میں لکھی ہوئی یہ سر گذشت فارغ بخاری کی اپنی ہی نہیں سارے جہان کی آپ بیتی بھی ہے۔

○

گوشۂ ادب - چوک انارکلی - لاہور